قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۶۲۱۹

انتظامیہ

چیئرمین بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد خاں

ناظم۔ محمد لطیف چوہدری

مجلسِ ادارت

حسین امیر فرہاد۔ میجر محمد یوسف ڈار۔ محمد عمر دراز

ناشر: عطاء الرحمٰن ارائیں

طابع: سید عبد السلیم

مطبع آفتاب عالم پریس ۱۲ ہسپتال روڈ لاہور

مقامِ اشاعت

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور۔

جلد ۴۷ جولائی ۱۹۹۴ء شمارہ ۷

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: ۱۰/- روپے

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۲
دُعا	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۶
بنیادی حقوقِ انسانیت	محمد عمر دراز	۱۶
قرآنی سیرتوں کو ڈھالئے	حکیم محمد مسیح الدین صدیقی (بھارت)	۲۴
گزرگاہِ خیال	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۲۶
تم سبھی کچھ ہو....	حسین امیر فرہاد	۴۴
حقائق و عبر	ادارہ	۴۹
میری زندگی کا ناقابلِ فراموش واقعہ	اعزاز الدین احمد خاں	۵۴
پاکستان کے پانچ ٹکڑے	معین باری	۵۷
بچوں کے صفحات	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۶۰
درسِ قرآن	ادارہ	۶۲
مراسلات	سید عبد الودود	۶۵
نوعِ انسانی اور قدرتی وسائل	محمد ارشاد	۷۰
انگریزی مضامین		۷۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

پاکستان میں دو ۲/۱ چھٹیاں

پچھلے دنوں وفاقی کابینہ نے ہفتے میں پانچ دن کام کرنے اور ڈیڑھ دن (جمعہ ہفتہ) تعطیل کرنے کی منظوری دے دی۔ یہ وہی چھٹی ہے جو سابق صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم نے نافذ کی تھی۔ پھر بسیار خرابی کی بنا پر ترک کرنی پڑی۔ کیونکہ ثابت ہوا کہ یہ ملک کے لئے فائدہ مند نہیں بلکہ نقصان دہ ہے۔ موصوف نے زکوٰۃ آرڈیننس نافذ کیا تھا اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ کئی ایک کو مستثنیٰ قرار دینا پڑا۔

ایک جانب بجلی کی کمی کا رونا رویا جا رہا ہے دوسری جانب ٹیلی ویژن پر صبح کی نشریات کا آغاز کر دیا جو سکول جانے والے بچوں اور دفتر جانے والے بڑوں کے پیروں میں زنجیر بنی ہوئی ہے۔

پھر احیائے اسلام کی ابتداء ڈرائیور سے کی۔ کہا۔ کسی کو کچل ڈالنے کی صورت میں تمہیں خون بہا' ایک لاکھ باسٹھ ہزار کے قریب ادا کرنا پڑے گا۔ ڈرائیوروں نے چابیاں پھینک دیں۔ کہا۔ اتنی رقم اگر ہمارے پاس ہوتی' تو ہم موت کی کرسی پر نہ بیٹھتے کوئی اور کاروبار کر لیتے۔ تب عاقلہ کو شامل کیا گیا۔ مگر بات بنی نہیں۔ لہٰذا یہ بلا بیمہ کمپنیوں پر ڈال دی گئی۔

بلاشبہ ترقی یافتہ ممالک میں ہفتے میں دو چھٹیاں (یعنی ہفتے میں چالیس گھنٹے کام) کرتے ہیں۔ مگر وہ لوگ زندگی کے ہر شعبے میں خود کفیل ہیں۔ انہیں کسی قسم کی محتاجی' زیردستی' ناداری' مفلوک الحالی کا سامنا نہیں۔ وہ دنیا کے ترقی پذیر ممالک کی امداد کرتے ہیں' قرضے دیتے ہیں' سامانِ حرب وضرب سے لے کر سامانِ عیش وطرب تک وہ مہیا کرتے ہیں۔ اگر وہ دو چھٹیاں کرتے ہیں تو انہوں نے اپنے حصے کا کام کر دیا۔ انہیں حق ہے آرام کرنے کا۔

جو خاتون باورچی خانے سے فراغت پا لے وہ بے شک ٹی وی کے سامنے بیٹھی رہے مگر جس کا سارا کام پڑا ہو قریب نہیں دیتا کہ وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھے۔

ہفتے میں دو دن چھٹی کرنے سے ہم بھی ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں شامل ہو جائیں گے؟ اگر ایسا ہے تو

دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ ورنہ ہمیں تو حکم ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ ..... (۱۰-۹/۶۲)

اے جماعتِ مومنین! تم اپنی جماعتی زندگی کو زندہ و پائندہ رکھنا کہ یہی دین کا تقاضا ہے۔ اس کے لئے مثلاً جب تمہیں ملی اجتماع صلوٰۃ کے لئے آواز دی جائے تو سب کام چھوڑ کر اس کی طرف لپک کر جایا کرو۔ تاکہ تم اپنے کانوں سے سُن لو کہ وہ قوانین و ہدایاتِ خداوندی کیا ہیں جن کے لئے تمہیں بلایا گیا ہے اور جن کے مطابق تمہیں کام کرنا ہے۔ اگر تم ذرا بھی علم و بصیرت سے کام لوگے تو یہ حقیقت تمہارے سامنے آجائے گی کہ یہ اجتماعات تمہارے لئے کتنے منفعت بخش ہیں۔

جب یہ اجتماعِ صلوٰۃ ختم ہو جائے تو پھر جہاں جی چاہے جاؤ اور تلاشِ معاش میں لگ جاؤ۔ (مفہوم)

دیکھا آپ نے یعنی صلوٰۃ الجمعہ کے بعد رزق کی تلاش میں پھیلنے کا حکم ہے، چھٹی کا نہیں۔ اگر دیگر ترقی یافتہ قوموں کی تقلید کرنی ہے، تو سائنس اور ٹیکنالوجی کا میدان موجود ہے تاکہ ہم ترقی یافتہ قوموں کی صف میں نمایاں نہ سہی کوئی بھی جگہ حاصل کر لیں۔

اگر ان کی گاڑی پچاس کلومیٹر کی رفتار سے جا رہی ہے اور ہم نے ان سے آگے نکلنا ہے تو ہمیں رفتار دوگنی کرنی ہوگی۔ اگر وہ ہفتے میں دو دن گاڑی درخت کے نیچے کھڑی کر کے آرام کرتے ہیں۔ ہم بھی ویسا ہی کریں تو ہم قیامت تک ان کے برابر نہیں پہنچ سکتے۔ فاصلہ درمیان میں برقرار رہے گا۔ ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بشانہ پہنچنے کے لئے انتھک محنت اور لگن کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ہمارے دلوں میں منزل تک پہنچنے کی تڑپ ہونی چاہیئے۔

دیکھا جائے تو اس چھٹی سے سبتیین (یہود) کو خوشی ہوئی ہوگی کیونکہ ہفتہ یعنی یوم السبت ان کا متبرک دن ہے۔ ورنہ اہلِ وطن تو احتجاج اور ہڑتال کی دھمکی دے رہے ہیں۔

ویسے بھی دیکھا جائے تو ہمارے سرکاری دفاتر میں کام کیا ہو رہا تھا۔ افسران اور ماتحتوں کا صبح دیر سے آنا جانے کے دَور اور گپیں ہانکنا، یار دوستوں اور عزیز و اقارب کو لمبی لمبی کالیں کرنا، قبل از وقت دفتر سے غائب ہو جانا۔

ان کے لئے دو چھٹیاں ایسے ہی ہیں جیسے تنخواہ کے علاوہ کسی کو بونس بھی دیا جائے۔
حکومت کو چاہیئے کہ اپنے فیصلے پر مزید غور کرے، قوم کو سست الوجود اور ناکارہ نہ بنائے۔

کیا پاکستان کا مطالبہ ایک فراڈ تھا؟

مولا فضل الرحمٰن ابن مولانا مفتی محمود دیوبندی سیکرٹری جنرل جمعیت علماء پاکستان نے سعودیہ میں عمار احمد ترین انجینئر (جنہیں سعودی حکومت نے مسجد نبوی کی دیکھ بھال کے لئے ملازم رکھا ہے) کو ایک انٹرویو دیا جو سب سے پہلے بیدار ڈائجسٹ نے جنوری ۱۹۹۴ء کو شائع کیا۔ پھر ۲۸ جنوری کو ہفت روزہ 'زندگی' نے چھاپا۔ نیویارک ہفت روزہ اُردو ٹائم نے بھی شائع کیا۔ ماہنامہ حکایت میں اپریل میں چھپا۔ حتّٰی کہ روزنامہ خبریں نے بھی مئی ۱۹۹۴ء کو شائع کیا اور مارچ ۱۹۹۴ء کے نوائے وقت میں بھی چھپا۔ اب ماہنامہ کنزالایمان جون ۱۹۹۴ء میں بھی شائع ہوا۔

جب مولانا سے سوال کیا کہ آج تک پاکستان بنے نصف صدی ہونے والی ہے ہمارے علماء اپنے مدرسوں اور درسِ نظامی سے نکل کر قومی دھارے میں کیوں نہ شامل ہوئے؟ ٹیکنالوجی کے متعلق پیش قدمی کیوں نہ کی؟ جبکہ آج اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ انہیں حقارت سے اور علماء انہیں نفرت سے دیکھتے ہیں۔ آپ لوگ کیا منصوبہ بندی کر رہے ہیں اس خلیج کو پاٹنے کی جو مذہبی طبقہ اور اعلیٰ تعلیمیافتہ طبقہ میں بدقسمتی سے پائی جاتی ہے۔

مولانا نے جواب دیا کہ ہمارا مقصد یہ بھی ہے کہ ہم اس خلیج کو ختم کر دیں اور ہم اعلیٰ تعلیم پر بھی زور دیتے ہیں ہمیں انجینئروں اور ڈاکٹروں کی بھی ضرورت ہے۔ جہاں تک پاکستان کی اساسیت کا سوال ہے تو پاکستان کا وجود اسلام کے لئے قطعاً نہ تھا بلکہ مغربی سسٹم کو بچانے کے لئے اس کو غلط ہاتھوں کے ذریعے لایا گیا۔ یہ سب فراڈِ اعظم تھا جو اسلام کے نام پر کھیلا گیا۔

طلوعِ اسلام

مولانا اور ان کے والد مفتی محمود مرحوم کی ہمدردیاں اور وفاداریاں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ تعجب یہ ہے کہ یہ انٹرویو ۲۸ جنوری ۱۹۹۴ء سے آج تک شائع ہو رہا ہے۔ اس پر تبصرے ہو رہے ہیں۔ یقیناً یہ مولانا کی نظروں سے گزرے

ہوں گے۔ مگر آج تک انہوں نے اس کی تردید نہ کی۔ اس سے کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اور پھر مولانا مفتی محمود کا بیان ریکارڈ پر ہے کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھے۔ (نوائے وقت لاہور۔ اداریہ مارچ ۱۹۹۴ء)۔

لہٰذا یہ تعجب کی بات نہیں، اگر ان کا فرزند پاکستان کو فراڈِ اعظم کہے۔

بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا (۳۱/۲۱)

یہ اسی راستے پر چلیں گے جس پر انہوں نے اپنے باپ دادا کو چلتا پایا۔ مگر حیرانگی کی بات یہ ہے کہ یہ حضرات اسی ٹہنی کو کاٹ رہے ہیں جس پر ان کا آشیانہ ہے اور بیٹھے پھل کھا رہے ہیں۔

اگر پاکستان فراڈ ہے، تو اس کی اسمبلیاں فراڈ، اندر بیٹھے ہوئے فراڈیا کہلائیں گے۔ جن میں ایک نام مولانا فضل الرحمٰن کا بھی ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ مولانا جیسی مطہر ومنظف شخصیت اپنی نشست کو لات مار کر باہر نکل آئے اور فراڈ سے حاصل کی ہوئی اس سرزمین سے بھارت جیسے پوتر استھان کی طرف ہجرت کر جائیں۔ وہاں روز گنگا جل سے اشنان کیا کریں۔ اس سے ان کے پتا کی آتما کو شانتی ملے گی اور ہجرت کی سنت بھی ادا ہو جائے گی۔ قرآن اگر کہتا ہے کہ یہ کفار تمہارے دشمن ہیں (۴/۴۵) یا جو لوگ تمہارے دین کو مذاق سمجھیں ان سے دوستی اور تعلقات قائم مت کرو (المائدہ، ۵۷) تو کہتا رہے۔ ہم اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

فاعتبروا یا أولی الابصار (۵۹/۲)

فرد اور معاشرہ

کسی ایسے معاشرے کی تعمیر جدید ممکن ہی نہیں جس کے افراد کی تعمیر جدید نہ ہوئی ہو۔ انفرادی عدم توازن کا نتیجہ کبھی سماجی توازن نہیں ہو سکتا اور سکون قلب انفرادی اور سماجی توازن کی لازمی شرط ہے۔

(محمد شفیع الدین)

اَرجعی اِلیٰ رَبّک

لمعات مجلہ طلوعِ اسلام' بابت ماہ مئی ۱۹۹۴ء پر محترم محمد عمر دراز صاحب کا مختصر تبصرہ اور اضافی نکات شمارہ جون میں شائع ہوئے تھے۔ اس وقت وعدہ کیا گیا تھا کہ دُعا کے موضوع پر مفصل قرآنی تعلیمات جو مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ تھیں' جولائی کے شمارہ میں پیش کی جائیں گی۔ اس وعدہ کے ایفا میں ہم علامہ موصوف کی معرکۃ الآرا کتاب "کتاب التقدیر" کا باب بعنوان "دعا" قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

مدیر

دُعا

اب ہم اپنے سفرِ تحقیق کی اس وادی میں اُتر رہے ہیں جہاں (بقول کسے) فرشتوں کے بھی پَر جلتے ہیں۔ ہمارے موضوع کے اس گوشے کا تعلق قلبِ انسانی کے نازک ترین گوشے سے ہے۔ دعا کا رشتہ خالصتہً انسانی جذبات سے ہے اور قرآن کریم کی تلقین و تاکید یہ ہے کہ تم' تمام مسائلِ حیات کے متعلق فکر و تدبر سے کام لو' اور ان پر علم و بصیرت کی رو سے غور کرو۔ فکر و جذبات کا یہی وہ تصادم ہے جس کے پیشِ نظر ہم نے کہا ہے کہ اب ہم اس وادی میں اتر رہے ہیں جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ جب تاریخ کے اسٹیج پر اولین انسان ہمارے سامنے آتے ہیں' تو ہم انہیں کسی مافوق الفطرت' ان دیکھی قوت (یا قوتوں) سے دعائیں مانگتے پاتے ہیں۔ اور یہ منظر' تاریخِ انسانیت کے ہر دور' ہر زمانے' ہر ملک اور

جذبۂ دعا کی عالمگیریت

ہر قوم میں مسلسل اور متواتر ہمارے سامنے آتا چلا جاتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں ہزار اختلاف ہو۔ ان کے طرز بود و ماند اور اندازِ معاش و معاشرت میں' لاکھ تفاوت ہو۔ ان کی تہذیب ایک دوسرے سے مختلف اور ان کا تمدن الگ الگ ہو۔ وہ مختلف زبانیں بولیں۔ ان کی نسلیں بھی الگ الگ ہوں۔ مختصر الفاظ میں' ان میں کوئی شے بھی مشترک نہ ہو' اس کے باوجود ان میں ایک چیز بطور قدرِ مشترک ضرور پائی جائے گی — اور وہ ہوگی' کسی مافوق الفطرت قوت سے دعائیں مانگنا۔ اس قوت کے متعلق ان کے تصورات الگ الگ ہوں گے[1]' اس سے دعائیں مانگنے کی رسوم

---

[1] ہمارا مقصد وحی کی رو سے عطا کردہ خدا کا تصور نہیں۔ اس میں' زمان و مکان کے بُعد و اختلاف سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہمارا مطلب ذہنِ انسانی کا تراشیدہ تصور ہے۔

اور آداب مختلف ہوں گے۔ ان کی طلب اور تقاضے بھی متنوع ہوں گے۔ لیکن ان تمام محسوس پیکروں کے پیچھے جذبۂ محرکہ ایک ہی ہوگا — یعنی اپنی مدد کے لئے کسی ان دیکھی قوت سے التجا کرنا۔ اس سے کچھ مانگنا۔ اسی کو دعا کہا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جسے پرستش کہا جاتا ہے، وہ بھی درحقیقت دعا، یا دعا کی مظہر ہوتی ہے۔ پرستش کے ہر پروگرام کا اختتام دعا پر ہوتا ہے۔ اُس ان دیکھی قوت کے حضور جو نذر نیاز پیش کی جاتی یا منت مانی جاتی ہے، وہ بھی دعا کی قبولیت کے ساتھ مشروط ہوتی ہے۔ "اگر میری فلاں مراد پوری ہو جائے تو میں یہ کروں" کے الفاظ ہر دور میں سنائی دیتے ہیں۔ دعا، ہر بے سہارا کا سہارا۔ ہر بے آسرا کا آسرا۔ ہر لاچار کا آخری چارہ۔ ہر ضعیف و ناتوان کا سامانِ تقویت۔ ہر بے نوا کے لئے نوائے حیات۔ ہر مایوس کے لئے شمع امید۔ ہر قلبِ مضطر کے لئے سامانِ تسکین۔ ہر جگر سوزاں کے لئے مرہم تشفی۔ ہر چشم گریاں کے لئے پنبۂ تسلی۔ اور ہر راندہ و درماندہ کی آخری پناہ گاہ ہوتی ہے۔ جب فکر و تدبر کی دنیا کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو دعا کی دنیا کا آغاز ہوتا ہے، اور سب سے زیادہ پرخلوص اور پُرسوز وہ دعا ہوتی ہے جس میں فکر و تدبر کی ذرا سی بھی آلائش نہ ہو۔ دعا میں جتنی زیادہ محویت ہو گی اتنی ہی اس کی قبولیت کی توقع زیادہ ہو گی — اور محویت کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس میں اس قدر جذب ہو جائے کہ اسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہے۔

آپ سوچئے کہ جس جذبہ کی کیفیت یہ ہو اس کے متعلق فکر و تدبر سے غور کرنا اور اسے علم و بصیرت کی رُو سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرنا، دیوانگی نہیں کہلائے گا تو اور کیا ہوگا؟ لیکن قرآن کے طالب علم کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اس قدر نازک مقامات میں بھی فکر و بصیرت کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔ جو قرآن، آخرت جیسی ماورا الطبیعیاتی حقیقت پر بھی غور و فکر کی تاکید کرتا ہے (۲/۲۱۹—۲۲۰)۔ وہ کسی موضوع کی نزاکت کی بنا پر اسے گرداب جذبات کے حوالے کرنے کی اجازت کب دے سکتا ہے۔ وہ اسے بھی علم و بصیرت کی رو سے سمجھاتا، اور فکر و شعور کی رو سے سمجھنے کی تاکید کرتا ہے، بالخصوص اس لئے کہ اس (دعا) کا تقدیر کے مسئلہ سے بڑا گہرا تعلق ہے اور عمل کی دنیا سے بڑا بنیادی رشتہ۔ ہم اس موضوع پر اسی انداز سے غور کریں گے اور اپنے قارئین سے درخواست کریں گے کہ وہ بھی اسے اسی انداز سے سمجھنے کی کوشش کریں اور اس میں اپنے جذبات کو (جنہیں ہو سکتا ہے کہ بعض مقامات پر ٹھیس بھی لگے)، عناں گیر نہ ہونے دیں۔ راستہ دشوار گزار اور پُرخار ہے — ایسا دشوار گزار اور پُرخار

کہ یہاں حکیم الامت جیسے دیدہ ور کو بھی کہنا پڑا کہ۔

مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبال
مقامِ شوق میں کھویا گیا یہ دیوانہ

لیکن ہمیں امید ہے کہ اگر ہم نے اس منزل میں قرآن جیسے خضرِ راہ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، تو ہم چشمۂ حیواں تک بآسانی پہنچ جائیں گے کہ وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹)۔ اس کا ارشاد ہے۔

دعا کا عام مفہوم

ہمارے ہاں دعا کا عام مفہوم، خدا سے کچھ مانگنا لیا جاتا ہے۔ اس میں مانگنے کا تصور ایسا غالب اور عمیق ہوتا ہے کہ ہم "دعا مانگنے" کے الفاظ بھی عام طور پر بولتے ہیں، حالانکہ اگر خود دعا سے مفہوم "مانگنا" لیا جائے تو "دعا مانگنا" کی ترکیب بے معنی اور بے ربط ہو جائے گی۔ عربی زبان میں **دعا** کے معنی مانگنا نہیں، بلکہ کسی کو آواز دینا، بلانا، پکارنا ہیں۔ لیکن چونکہ عام طور پر کسی کو مدد کے لئے پکارا جاتا ہے، اس لئے اس کے معنی مدد مانگنے کے لئے جاتے ہیں۔

قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک ہی لفظ ان لوگوں کے لئے بھی استعمال کرتا ہے جو حضرات انبیاء کرام کے لائے ہوئے دین خالص کے نہیں، بلکہ اس کی محرف شکل، مذہب، کے پیرو ہوتے ہیں، اور ان کے سلسلہ میں بھی جو دین خالص (قرآن) کے متبع ہوتے ہیں۔ جب وہ ایک لفظ کو اول الذکر کے سلسلہ میں استعمال کرتا ہے تو اس سے وہی مفہوم لیتا ہے جو ان کے ہاں مروج ہوتا ہے، اور جب اسی لفظ کو ثانی الذکر کے ضمن میں استعمال کرتا ہے تو اس سے صحیح قرآنی مفہوم لیتا ہے۔ مثلاً وہ الٰہ کا لفظ دونوں کے لئے استعمال کرتا ہے لیکن مذہب پرستوں کے ہاں اس کا تصور کچھ اور ہوتا ہے اور دین کی رو سے کچھ اور۔ یا جب وہ عبادت کا لفظ استعمال کرتا ہے، تو مذہب پرستوں کے ہاں اس سے مفہوم پرستش، پوجاپاٹ، (WORSHIP) ہوتا ہے، لیکن دین کی رو سے اس کے معنی احکام و قوانین خداوندی کی اطاعت ہوتا ہے۔ دین میں پرستش کا تصور نہیں بلکہ اطاعت اور محکومیت کا تصور ہوتا ہے، اور الٰہ سے مفہوم وہ بلند و بالا صاحب اقتدار ہستی جس کے احکام و قوانین کی اطاعت کی جائے، اسی طرح جب وہ دعا۔ یدعو وغیرہ کے الفاظ، مذہب پرستوں کے لئے لاتا ہے تو اس سے

ان کا وہ تصور مقصود ہوتا ہے جس کی رو سے وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کو مدد کے لئے پکارتے ہیں لیکن جب یہی لفظ خدا کے سلسلہ میں استعمال کرتا ہے تو اس سے مقصود محض "پکارنا" نہیں ہوتا۔ خدا کی اطاعت کرنا بھی ہوتا ہے۔ دعا کا قرآنی مفہوم سمجھنے کے لئے اس بنیادی فرق کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ پہلے ہم قرآن کے وہ مقامات سامنے لاتے ہیں جن میں یہ لفظ 'اطاعت' کے معنوں میں آیا ہے۔

سورۃ المومن میں ہے۔ هُوَ الْحَيُّ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۔۔۔۔۔ وہ (خدا) زندہ ہے اور زندگی بخش۔ اس کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ اس کے لئے

دعا کے معنی اطاعت کرنا

تم اطاعت اور محکومیت کو اس کے لئے خالص اور مختص کرتے ہوئے اسے پکارو" (ہم اس کا ترجمہ "پکارو" ہی کریں گے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ قرآن کی رو سے خدا کے پکارنے سے مراد اس کی اطاعت کرنا ہے)۔ اس کے بعد ہے قُلْ إِنِّيْ نُهِيْتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔۔۔۔۔ (اے رسول!) ان سے کہہ دو کہ مجھے اس سے منع کر دیا گیا ہے کہ میں' ان کی عبودیت (محکومیت' اطاعت) اختیار کروں جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر" پکارتے ہو" یہاں دیکھئے۔ دعا (پکارنا) اور عبادت (اطاعت کرنا) کے الفاظ مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ اور آخر میں ہے وَ أُمِرْتُ أَنْ أُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ (۴۰ / ۶۵ ۔ ۶۶) ۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں صرف خدائے رب العالمین کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کروں۔" اسلم" نے دعا اور عبادت کے الفاظ کا مفہوم بالکل واضح کر دیا یعنی احکام خداوندی کے سامنے جھک جانا۔

سورۃ مریم میں حضرت ابراہیمؑ کے تذکار جلیلہ کے ضمن میں کہا کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا وَ أَعْتَزِلُكُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ میں تم سے بھی قطع تعلق کرتا ہوں اور ان سے بھی جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر" پکارتے ہو" وَ أَدْعُوْا رَبِّيْ ۔ میں اپنے رب کو "پکارتا ہوں"۔ اس کے بعد ہے فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔۔۔۔۔ (۱۹ / ۴۸ ۔ ۴۹) چنانچہ جب اس نے اُن سے، اور جن کی وہ عبادت کرتے تھے ان سے قطع تعلق کر لیا۔ یہاں بھی دیکھئے تَدْعُوْنَ اور يَعْبُدُوْنَ کے الفاظ مرادف معانی میں استعمال کئے گئے ہیں۔

سورۃ مومن میں ہے وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۔ تمہارا رب

تم سے کہنا ہے کہ تم مجھے "پکارو"۔ میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ (پکار کا جواب دوں گا" اس کا قرآنی مفہوم آگے چل کر سامنے آئے گا) اس کے بعد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ ○ (۴۰/۶۰)۔ جو لوگ میری عبادت (اطاعت، محکومیت) سے سرکشی اختیار کرتے ہیں وہ ذلیل و خوار ہو کر داخلِ جہنم ہوں گے۔ یہاں بھی دیکھئے۔ دعا اور عبادت کے الفاظ ہم معنی آئے ہیں۔

سورۂ طور میں ہے کہ اہلِ جنت سے پوچھنے والے پوچھیں گے کہ تم نے کیا کیا تھا جس کی وجہ سے تم جنت کے مستحق قرار پاگئے، وہ جواب میں کہیں گے کہ اِنَّا کُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ (۵۲/۲۸)۔ ہم اس سے پہلے (دنیاوی زندگی میں) خدا کو "پکارا کرتے تھے"۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد احکامِ خداوندی کی اطاعت ہی ہو سکتی ہے کیونکہ محض خدا کو پکارنے سے تو کوئی بھی جنت کا مستحق اور وارث قرار نہیں پاسکتا۔

ایک مقام پر رسول اللہؐ سے کہا گیا ہے کہ قُلْ اِنَّمَا اَدْعُوْا رَبِّیْ وَ لَا اُشْرِكُ بِهٖ اَحَدًا (۷۲/۲۰)۔ ان سے کہو کہ میں صرف اپنے رب کو "پکارتا ہوں" اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہاں بھی "پکارنے" سے مراد، خدا کی عبودیت اختیار کرنا، اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کرنا ہے۔ (شرک کے معنی ہی غیر خداوندی اقتدار کی اطاعت ہے)۔

یہی حضرات انبیاء کرامؑ کی عام دعوت تھی کہ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (۲۶/۲۱۳ ؛ ۲۸/۸۸)۔ اللہ کے علاوہ کسی اور کو نہ "پکارو" (نیز ۷۲/۱۸)۔

سورۂ انعام میں واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ اے رسول! ان لوگوں سے کہہ دو کہ جب مجھے خدا کی طرف سے اس قسم کی روشن ہدایت (راہ نمائی) مل چکی ہے تو اس کے بعد میں بھلا غیر اللہ کو کس طرح "پکار سکتا ہوں"۔ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۶/۷۱)۔ جبکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں خدائے ربّ العٰلمین کے سامنے ہی جھکوں۔ اس کے سوا کسی اور کے احکام کی اطاعت نہ کروں — ہدایت خداوندی اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے الفاظ واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ "خدا کو پکارنے" سے مراد اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کرنا ہے۔

اس کے بعد ہم ان مقامات کی طرف آتے ہیں جہاں "خدا کو پکارنے" سے مراد دعوتِ عام میں "دعا مانگنا" ہیں۔ لیکن ان مقامات کو سامنے لانے سے پہلے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ دعا کے اس مفہوم سے جو

شکوک و اعتراضات ابھرتے ہیں، انہیں بھی سامنے لایا جائے۔

دعا کا عام مفہوم

اگر عقیدہ یہ ہو کہ انسان کی زندگی میں جو کچھ ہونا ہو، اسے خدا نے پہلے سے لکھ دیا ہوتا ہے، اور یہ (قسمت کا لکھا) اٹل ہوتا ہے، تو پھر دعا کے کچھ معنی ہی نہیں رہتے۔ مثلاً ایک شخص کے متعلق پہلے سے طے شدہ ہے کہ اس نے اتنے دن بیمار رہ کر مر جانا ہے۔ اب اس کے لئے، وہ خود یا اس کے متعلقین لاکھ دعائیں کریں، قسمت کے لکھے میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ وہ اُتنے دن بیمار رہے گا اور اس کے بعد مر جائے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ نہیں، دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے تو پھر یہ عقیدہ غلط قرار پائے گا کہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے۔

اس سے پیدا ہونیوالے شکوک

جو فیصلہ بدل سکتا ہے — خواہ وہ دعا سے بدلے یا تدبیر سے — وہ اٹل نہیں کہلا سکتا۔ اور اس کے ساتھ ہی، اس عقیدہ کی رو سے، خود اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی عجیب سا تصور سامنے آتا ہے کہ پہلے اس نے ایک بات کا فیصلہ کر دیا اور کہہ دیا کہ ہمارا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ اس کے بعد وہ انتظار کرنے لگا کہ اگر اس شخص نے (یا اس کے متعلقین نے) ہم سے درخواست کی تو ہم اپنا فیصلہ بدل دیں گے، اور اگر خاموش رہے تو وہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ سوچئے کہ خدا کے متعلق اس قسم کے تصور سے کیسے اشکال لاحق ہوتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہر بات پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہر معاملہ کا فیصلہ ساتھ کے ساتھ کرتا ہے تو اس سے اور بھی زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً زید اور بکر کا باہمی مقدمہ ہے جس کا فیصلہ عدالت نے کرنا ہے۔ زید حق پر ہے اور بکر جھوٹا ہے۔ دونوں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی دعا قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ مقدمہ کا فیصلہ لامحالہ ایک ہی کے حق میں ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کی دعا قبول ہوگی۔ اگر کہا جائے کہ اس کی دعا قبول ہوگی جو زیادہ گڑگڑا کر دعا مانگے، تو ہو سکتا ہے کہ بکر زیادہ خشوع و خضوع سے دعا مانگے۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا جو حق پر نہیں، اور مقدمہ کا فیصلہ اُس کے خلاف ہوگا جو برسرِ حق ہے!

اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا جو حق پر ہے (یعنی زید کی) تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زید دعا نہ مانگتا تو پھر کیا ہوتا۔ کیا پھر خدا بکر کا ساتھ دیتا کیونکہ اس نے دعا مانگی تھی اور

زید نے دعا نہیں مانگی تھی؟

اور اگر کہا جائے کہ خدا بہر حال، حقدار کا ساتھ دیتا ہے، تو اول یہ چیز واقعہ کے خلاف ہے۔ ہمارے ہاں عدالتوں سے آئے دن ایسے فیصلے صادر ہوتے رہتے ہیں جو حق کے خلاف ہوتے ہیں ——— حتیٰ کہ کئی بے گناہ پھانسی کے تختے پر چڑھا دیئے جاتے ہیں ——— لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ خدا حق کا ساتھ دیتا ہے تو اس صورت میں دعا کا پھر کوئی مطلب نہ رہا۔ حقدار دعا کرے یا نہ کرے، خدا بہر حال اس کا ساتھ دے گا اور جو حق پر نہیں، وہ لاکھ دعائیں کرے، خدا اس کی سنے گا نہیں۔

اگر کہا جائے کہ خالی دعا نہیں بلکہ دعا کے ساتھ تدبیر بھی ضروری ہے۔ دعا سے تدابیر کامیاب ہو جاتی ہیں۔ تو اس سے پھر وہی دشواری لاحق ہو جاتی ہے۔ زید اور بکر دونوں تدبیر کرتے ہیں لیکن بکر اس کے ساتھ دعا بھی کرتا ہے اور زید دعا نہیں کرتا۔ تو کیا، اس صورت میں بکر کی تدبیر کارگر ہو جائے گی کیونکہ اس نے دعا بھی کی تھی اور زید ناکام رہ جائے گا کیونکہ اس نے دعا نہیں کی تھی۔ (حالانکہ وہ حق پر تھا)۔

یہ ہیں وہ اشکال جو ہمارے ہاں کے مروجہ عقائد کی رو سے، دعا کے سلسلہ میں ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ہمارے سامنے سورۂ بقرہ کی وہ آیت آتی ہے جسے دعا اور اس کی قبولیت کے ضمن میں بنیادی طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن جس کا غلط مفہوم ان دشواریوں میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ .... (2/186)

اور اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

(اے رسول!) جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے، (تو میں اس کی پکار (کو سنتا اور اسے) قبول کرتا ہوں۔

اس ترجمہ کی رُو سے دشواری یہ پیش آتی ہے کہ ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ مظلوم و مقہور، غریب و نادار، بیکس و بے بس، مصیبت زدہ لوگ گڑگڑا، گڑگڑا کر خدا سے دعائیں، مانگتے ہیں لیکن ان کی کوئی مصیبت رفع نہیں ہوتی۔ ان کی ساری عمر ظلم و ستم سہتے سہتے مصیبتوں میں کٹ جاتی ہے۔ لہٰذا، اس امر واقعی کی

موجودگی میں یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہر پکارنے والوں کی پکار کو سنتا اور اس کی دعا کو قبول کرتا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سنتا تو سب کی ہے لیکن کرتا وہی ہے جو دعا مانگنے والے کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ جو کچھ ہوا ہے اس کے حق میں وہی بہتر تھا۔ لیکن یہ جواب (قطع نظر اس سے کہ ستم رسیدہ، مصیبت زدہ برسر حق مظلوم انسان کا اس سے حقیقی اطمینان نہیں ہو سکتا) بڑے دور رس (تخریبی) نتائج کا موجب بن جاتا ہے۔ ایک مظلوم انسان، ظالم کی دست درازیوں کے خلاف خدا سے دعا کرتا ہے اور اس کے بعد دیکھتا ہے کہ اس کی حالت ذرا بھی بہتر نہیں ہوئی، بلکہ اس مستبد ظالم کے ظلم میں اور اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے، تو (مذکورہ بالا جواب کی رو سے) اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ ظالم کا ظلم اس کے حق میں بہتر اور خدا کی منشاء کے عین مطابق ہے اس لئے اسے اب نہ اس کے مظالم کے خلاف لب کشائی کرنی چاہیئے اور نہ ہی اس سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچنی۔ غور کیجئے کہ اس قسم کے عقائد، ظالموں کو کس طرح بد لگام چھوڑ دینے کا موجب بن جاتے ہیں۔ اس سے پہلے، ان ظالموں کے خلاف مظلوموں کے دل میں (کم از کم) انتقام کے جذبات تو ابھرتے تھے، اور ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے دست تظلم سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر سوچ لیتے۔ لیکن اس عقیدہ کے بعد تو صورت یہ ہوگی کہ مظلوم نہ صرف ظلم و زیادتی کو دل کے پورے سکون کے ساتھ برداشت کرے گا بلکہ ظالم کے حق میں دعائے خیر بھی کرے گا کہ وہ اس کے لئے بہتری کے سامان پیدا کر رہا ہے! یا للعجب۔ آپ نے دیکھا کہ مستبد قوتیں، محکوموں اور زیر دستوں کے لئے کس کس قسم کے عقائد وضع کرتی رہتی ہیں تاکہ وہ انہیں ذبح کریں اور یہ ان کے شکر گزار رہوں۔

اس سے بھی آگے بڑھئے تو یہ عقیدہ سامنے آتا ہے کہ خدا ہر ایک کی نہیں سنتا۔ وہ اپنے مقبول بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے۔ اسی عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ آپ کو ہر "حضرت صاحب" کے آستانِ عالیہ

خدا اپنے مقبول بندوں کی دعائیں سنتا ہے

پر مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے جو گڑگڑا، گڑگڑا کر، ہاتھ باندھے، اور اکثر ان کے پاؤں چومتے درخواست کرتے ہیں کہ یا حضرت! میرے لئے دعا کیجئے ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ برباد ہو جاؤں گا۔ اور یہ سلسلہ "حضرت صاحب" کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا، ان کی وفات کے بعد (جسے وفات نہیں بلکہ وصال

کہا جاتا ہے، یعنی ان کا اپنے محبوب ۔ خدا ۔ سے جا کر مل جانا) ان کے مزار شریف سے وابستہ ہو جاتا ہے، جہاں ان سے، سجدوں میں گر گر کر التجائیں کی جاتی، اور مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے تو جواب میں کہا جاتا ہے کہ ہم گنہگار بندے ہیں اس لئے ہماری خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ یہ حضرات مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہیں، اس لئے خدا ان کی بات مانتا ہے۔ یہ عقیدہ بھی رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی قرآن مجید کی وہ آیت بھی پڑھی جاتی ہے جسے ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ یعنی وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ۔ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ.....

"جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہدو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں"

ظاہر ہے کہ خدا کے مقربین کی وساطت سے خدا تک درخواست پہنچانے کا یہ عقیدہ ہمارے دورِ ملوکیت کی تخلیق ہے۔ اُس دور میں ذہنوں میں یہ بٹھایا گیا کہ السلطان ظل اللہ علی الارض۔ بادشاہ، زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جس قسم

السلطان ظل اللہ علی الارض کا عقیدہ

کا "سایہ" زمین پر دیکھا گیا اسی قسم کی اس کی "اصل" آسمان پر تصور کر لی گئی۔ اس سایہ کی رو سے، خدا کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ ظاہر ہے۔ یہاں کے بادشاہوں کی طرح وہ (شاہنشاہِ حقیقی) بھی ایک آمرِ مطلق سمجھا جاتا ہے ۔ نہ کسی قاعدے کا پابند نہ قانون کا ۔ جسے چاہا پکڑ لیا جسے چاہا نواز دیا۔ جسے چاہا بخش دیا جسے چاہا باندھ لیا۔ اسی سلسلہ میں بادشاہ کا دربار سامنے آیا جس میں سب سے پہلے حاجب و دربان کھڑے ملتے تھے۔ پھر اہلِ دربار میں سے مصاحب، امراء، وزراء اور پھر مقربینِ بارگاہِ سلطانیہ سامنے آتے تھے۔ کسی عام آدمی کے لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اپنی درخواست براہ راست سلطان المعظم تک پہنچا سکے۔ اس کے لئے اسے مقربین کے وسیلے کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہی نقشہ ہم نے دربارِ خداوندی کا متعین کر لیا۔ اس کی رو سے، خدا تک بات پہنچانے کے لئے اس کے مقربین کی وساطت ضروری قرار پائی۔ یہ ہے وہ ضرورت جس کے پیشِ نظر، خدا تک دعا پہنچانے کے لئے کسی "حضرت صاحب" کے وسیلہ کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ ہماری درخواست بھی خدا تک پہنچاتے ہیں اور اس کے ساتھ، سفارش بھی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی بات مان لیتے ہیں اور ہماری درخواست (دعا) منظور ہو جاتی ہے۔ درخواست کے ساتھ کچھ نذر نیاز بھی دینی پڑتی ہے، بعینہٖ جس طرح بادشاہوں کے

حضور نذرانہ گزارنا پڑتا ہے یا ان کے مقربین کی "خدمت" کرنی پڑتی ہے۔

یہ ہے خدا کا وہ تصور جو شاہنشاہیت نے ہمارے ذہنوں پر مرتسم کیا اور جس نے رفتہ رفتہ مقدس عقائد کی شکل اختیار کر لی۔ مرورِ زمانہ سے یہ عقائد اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئے کہ اب اگر ان کے خلاف کوئی بات کہی جائے تو اربابِ شریعت کی طرف سے اس پر کفر اور الحاد کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں، اور دامانِ طریقت سے وابستگان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ نعوذ باللہ حضرت صاحب کی طرف سے کیسا غضب نازل ہو جائے گا، حالانکہ ان حضرات کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (۷/۱۹۴) - وہ تمہارے ہی جیسے انسان (خدا کے بندے) ہیں۔ اور جن مزاروں پر جا کر مرادیں مانگی جاتی ہیں، یا انہیں خدا تک بات پہنچانے کا واسطہ قرار دیا جاتا ہے، ان کے متعلق کہا ہے کہ تم انہیں لاکھ پکارو، وہ تمہاری بات ہی نہیں سُن سکتے۔ اور اگر (بفرضِ محال) وہ سن بھی لیں تو اس کا جواب ہی نہیں دے سکتے (۳۵/۱۴) - تم انہیں جو کچھ پکار پکار کر کہتے ہو، وہ اس سے قطعاً بے خبر ہوتے ہیں۔ (۴۶/۵) - انہیں تو خود اپنے متعلق بھی اتنا علم نہیں ہوتا کہ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۱۶/۲۱)۔ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ جو اپنے حال سے بھی بے خبر ہیں وہ تمہاری کیا سنیں گے اور کیا مدد کریں گے؟

مؤمن صرف کھانے، پینے، کمانے اور عیش و آرام کی زندگی بسر کر کے مر جانے کے لئے پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ خدا کی زمین میں خدا ہی کا قانون جاری و نافذ کرنے کے لئے پیدا ہوتا ہے۔

محمد عمر دراز

بنیادی حقوقِ انسانیت

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ .... (۱۷/۷۰)

آجکل عالمی سطح پر حقوقِ انسانیت کا بڑا چرچا ہے اور یوں دکھائی دیتا ہے کہ یہ شاید عصرِ حاضر ہی کا کوئی مسئلہ ہو۔

حقوقِ انسانیت، اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں شامل ہیں اور اس تنظیم کے تحت پوری دنیا میں ہر سال اس حوالے سے ایک دن بھی منایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اب ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ انسان کے ان حقوق کی کھلے عام خلاف ورزیاں ہوتی ہیں۔ یہ خلاف ورزیاں بالعموم، طاقت ور اقوام کے ہاتھوں سرزد ہوتی ہیں اور ان کا ہدف تیسری دنیا کے کمزور ممالک، بالخصوص افریقی اور ایشیائی ممالک کے وہ خطے ہوتے ہیں جن میں اکثریت مسلم آبادی کی ہے، اور اب تو اس کا دائرہ کار یورپ کے ایسے خطوں کو بھی محیط ہو گیا ہے جہاں مسلمان آبادی کسی نہ کسی رنگ میں اپنے بنیادی حقوق کے تحفظ کی خاطر مصروفِ جدّوجہد ہے۔

یہ خلاف ورزیاں عام طور پر، بلکہ بدیہی طور پر، ترقی یافتہ اقوام، اپنے مخصوص مفادات کے حصول کے لئے کرتی ہیں اور ان میں اس حد تک بڑھ جاتی ہیں کہ کمزور اقوام کے وجود تک کو بھی مٹانے کے درپے ہو جاتی ہیں۔ اس کی زندہ مثالیں آج بوسنیا، فلپائن، کشمیر اور فلسطین کے مسلمانوں کی زبوں حالی اور کسمپرسی ہی نہیں بلکہ درندگی اور بربریت کا شکار ہونے کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔ ان علاقوں میں جس انسانیت سوز تشدّد کی مثالیں دنیا کے علم میں آ رہی ہیں، ان پر ان ہی ظالم اقوام کے بعض ایسے طبقے بھی چیخ اٹھے ہیں جن کے دل میں ابھی تک انسانیت کا کچھ نہ کچھ درد باقی ہے۔

اس عہد کی واحد سپر طاقت امریکہ کا، جو حقوقِ انسانیت کا سب سے زیادہ راگ الاپتی ہے، یہ طرزِ عمل دکھائی دیتا ہے کہ ابتداءً یہ ایک خاموش تماشائی کی حیثیت میں مبصر بنے رہتے ہیں تاآنکہ حالات ایسا رُخ اختیار کر لیں کہ حقوقِ انسانیت کے تحفظ کے بہانے ان کے لئے اس علاقے میں اپنا سیاسی اور فوجی اثر و نفوذ بڑھانا ممکن ہو جائے

تب یہ اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ اپنا پنجۂ استبداد آزمانے کے لئے آگے بڑھتے ہیں اور ان مظلوموں کی سرزمین پر اپنے پاؤں جما لیتے ہیں۔ یہ تصویر قرآن حکیم کی اس آیۂ جلیلہ کی تفسیر بن کر سامنے آتی ہے کہ

"یہ لوگ پہلے تو ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ مظلوم اپنا گھر بار چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو جائیں اور جب دوسری اقوام ان بے بسوں کو گرفتارِ ابتلا کر دیتی ہیں تو بنی نوع انسان کے یہ مزعومہ خیر خواہ ان کے انسانی حقوق واپس دلانے کے لئے آجاتے ہیں۔

..... تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ؕ وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ (۲/۸۵)

یاد کیجئے کس طرح تقریباً تمام بالادست اقوام نے باہم مل کر فلسطین سے اہلِ فلسطین کو نکال کر وہاں پر یہودی آبادیاں قائم کیں۔ ہزار سال سے آباد فلسطینیوں کو (جن کی اکثریت مسلمان تھی) دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کیا اور جب اپنے حقوق کے حصول کے لئے ان کی سالہا سال سے جاری تگ و دو رنگ لانے لگی تو کس طرح امریکہ نے دامِ ہمرنگِ زمین بچھا کر ان کی جملہ مساعی کا رُخ ہی بدل کر رکھ دیا۔

کشمیر کے حسین و جمیل خطّہ پر امریکہ کی نظریں پچاس کی دہائی کی ابتدا ہی سے مسلسل لگی ہوئی ہیں اور انہوں نے ہر وہ حربہ استعمال کیا ہے جس سے ان کے لئے اس علاقہ میں قدم جمانے اور اسے روس اور چین کے خلاف اپنی کارروائیوں کا مرکز و مرصاد بنانا ممکن ہو سکے۔ جبکہ اس وقت کی دوسری سُپر طاقت روس نے اپنے بیشتر وسائل سے ہندوستان کو اس حد تک لیس کیا کہ وہ اس کا کاسہ بردار بن کر امریکہ کو وہاں پر پاؤں نہ جمانے دے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے روس نے اقوامِ متحدہ میں کشمیر کے مسئلہ کے حل کے لئے پیش کی جانے والی تقریباً ہر قرارداد کو ویٹو کیا۔ اس طرح امریکہ کی اپنے اور روس کی اپنے مفادات کے حصول کی تگ و تاز نے اقوامِ متحدہ کی واضح ابتدائی قراردادوں کے باوجود آج تک مسئلہ کشمیر کا منصفانہ حل ممکن نہیں ہونے دیا اور یوں تظٰهَرُوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کی عملی تفسیر بنے رہے۔

اور اب تو کشمیری عوام پر ہندوستان کا جبر و تشدد اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ ہر صبح طلوع ہونے والا سورج کتنی ہی کشمیری ماؤں کے لختِ ہائے جگر کو شہید ہوتے، کتنی ہی کشمیری دلہنوں کو بیوگی کا لباس پہنتے اور کتنے ہی معصوم کشمیری بچوں کو یتیم ہوتے دیکھتا ہے اور یہ سلسلہ اس ظلم و بربریت کے علاوہ ہے جو ہر روز ان گنت بیگناہ کشمیری جوانوں کو پابندِ سلاسل کرنے میں روا رکھا جا رہا ہے، صرف اس جرم میں کہ وہ اپنے بنیادی حق خود ارادیت اور بنیادی حقوقِ انسانیت کے تحفظ کا تقاضا کیوں کر رہے ہیں۔

ان کے حقوقِ انسانیت کی ان عریاں خلاف ورزیوں پر تقریباً تمام عالمی تنظیموں نے، ماسوائے یہاں وہاں سے

کبھی کبھی اٹھنے والی دبی دبی سی آواز کے چپ سادھ رکھی ہے!

اب مفاد پرست عالمی قوتوں کے نزدیک غالباً ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں جہاں وہ انسانی حقوق کے علمبردار بن کر اولاً صلح کار کے روپ میں اس علاقہ میں داخل ہوں اور بعد میں اس انداز کا تصفیہ ٹھونسنے پر قادر ہو جائیں جس سے ان کے اپنے مقاصد کی برآوری ممکن ہو جائے۔ جیسے اس سے پہلے وہ فلسطین میں کامیابی سے کر چکے ہیں۔ امتِ مسلمہ اور بالخصوص ملتِ پاکستانیہ کے لئے یہ وقت کا اہم تقاضا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس دامِ ہمرنگِ زمین میں گرفتار ہونے سے بچائے۔

آیئے ہم آپ کو یاد دلائیں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے جب دنیا کے کسی گوشے میں حقوقِ انسانیت کا تصوّر تک نہ تھا آپ کے خالق، ربِّ ذوالمنن نے آپ کو کیا کیا بنیادی حقوقِ انسانیت دئے۔ یہ ایسے حقوق ہیں کہ جنہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے اس لئے کسی انسان، انسانوں کے گروہ یا مملکت کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ انہیں معطّل یا منسوخ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق یہ حقوق ہر انسان کو ہمیشہ حاصل رہنے چاہئیں۔

یوں تو ان حقوق کی تفاصیل پورے قرآن کریم میں بکھری پڑی ہیں۔ لیکن ان میں سے چیدہ چیدہ اور بنیادی حقوق کو محترم غلام احمد پرویزؒ نے اپنی کتاب "قرآنی قوانین" کے بارہویں باب کی زینت بنایا ہے۔ ہم علامہ موصوف کی مذکورہ کتاب سے اس باب کو یہاں نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

(٥)

یہ وہ حقوق ہیں جو ہر انسان کو، محض انسان ہونے کی حیثیت سے، بلاتفریقِ جنس، رنگ، نسل، مذہب، وطن، قومیت، یکساں طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ اسلامی مملکت ہر فردِ معاشرہ کو ان حقوق کی ضمانت دیتی ہے اور اگر وہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے سے قاصر رہ جائے تو افرادِ معاشرہ ان حقوق کو عدالت کے ذریعے بطور اپنے حق کے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ حقوق نمایاں طور پر حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ ہر انسانی بچہ، پیدائش کے اعتبار سے، یکساں عزت کا مستحق ہے۔ لہٰذا، پیدائش کی نسبت سے انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) "ہم نے ہر انسانی بچہ کو واجب التکریم بنایا ہے"۔ خدا کا ارشاد ہے۔

۲۔ معاشرہ میں مدارج کا معیار جوہرِ ذاتی اور سیرت و کردار ہے۔

وَ لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹)

ہر ایک کے مدارج اس کے اعمال کے مطابق متعین ہوں گے

۳۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں ہو سکتا۔ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر حقِ حکومت حاصل

نہیں ہوسکتا۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ..... (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں خواہ اسے کتاب (ضابطۂ قوانین) حکومت (انتظامی امور کی کارفرمائی) اور نبوت بھی کیوں نہ ملی ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ وہ اللہ کے نہیں بلکہ اس کے محکوم بن جائیں۔

محکومی صرف خدا کے احکام کی ہوسکتی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب ایک انسان دوسرے انسان کا محکوم نہیں ہوسکتا، تو وہ دوسرے انسان کا غلام کیسے ہوسکتا ہے؛ قرآن نے غلامی کے دروازوں کو ہمیشہ کے لئے بند کردیا ہے۔

۴۔ کوئی کسی کی محنت کو سلب نہیں کرسکے گا۔ ہر کام کرنے والا اپنے کام کا پورا پورا معاوضہ پائے گا۔ وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ..... (۳۹/۷۰) "ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ ملے گا۔"

"معاوضہ" کے معنی اُجرت (WAGES) نہیں۔ اُجرتوں کا تصور تو نظامِ سرمایہ داری کا پیدا کردہ ہے۔ جس کی قرآن نے جڑ کاٹ دی ہے۔ اس سے مراد، اس کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کیا جانا ہے۔ اس کی محنت کے ماحصل میں سے جو کچھ اس کی ضروریات سے زائد ہوگا اسے وہ بطیبِ خاطر، دوسرے ضرورتمندوں کے لئے دے دے گا۔ مثلاً ایک کسان اگر (اپنی محنت سے) سال بھر میں سو من غلہ پیدا کرتا ہے تو وہ غلہ بے شک اس کا ہے۔ اسے اس سے زبردستی کوئی چھین نہیں سکتا۔ لیکن وہ (اپنے ایمان کی رُو سے) اس میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دے گا۔ جو معاشرہ مومنین پر مشتمل ہوگا اس میں ایسا ہی ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، اسلامی مملکت میں معاشی نظام اسی قسم کا ہوگا۔

۵۔ ہر ایک کے ساتھ عدل ہوگا۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ (۱۶/۹۰)۔ حتّٰی کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل ہوگا۔

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۵/۸)

کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم اس سے عدل نہ کرو (۵/۲)

ہمیشہ عدل کرو اور دوست دشمن، ہر ایک سے ...... عدل کرو۔ یہ روش تمہیں اس معیارِ زندگی کے نزدیک تر لے آئے گی جس تک تمہیں خدا لانا چاہتا ہے۔

۶۔ عدل ہی نہیں، بلکہ جس شخص میں کوئی ایسی کمی آجائے جس کا وہ خود ذمہ دار نہ ہو، اس کی اس کمی کو پورا کرنا بھی۔ اسے احسان کہتے ہیں (۱۶/۹۰)۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۷۰/۲۴) جو کسی طرح بھی ذی احتیاج ہو یا کام کرنے کے قابل نہ رہے، معاشرہ کی دولت میں اس کا حصہ بطور حق کے ہے۔

۷۔ حقِ رزق ــــ یعنی تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا مہیا کرنا، اس نظامِ معاشرہ کے ذمہ ہے جو خدا کے نام پر قائم ہوتا ہے۔ وہ اعلان کرے گا کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲) "ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔

۸۔ جان کی حفاظت۔

۹۔ مال کی حفاظت۔ یعنی ہر وہ شے جسے قانون کی رو سے کسی کی ملک قرار دے دیا گیا ہو اس کی حفاظت (۴/۲۹)۔

۱۰۔ سکونت کی حفاظت۔ سورہ بقرہ میں کہا گیا ہے کہ لوگوں کو ان کے گھروں اور بستیوں سے نکال دینا جرم ہے (۲/۸۵)۔

۱۱۔ عصمت کی حفاظت (۲۴/۲)۔

۱۲۔ حُسنِ ذوق کا حق۔ یعنی قانون کے دائرے کے اندر رہتے، ذوقِ جمالیات کی تسکین کا حق۔ قرآنِ کریم نے نہایت تحدی سے کہا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲) "اے رسولؐ! ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو سامانِ آرائش و زیبائش (زیب و زینت) اور خوشگوار اشیائے خورونوش کو، جنہیں خدا نے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے، حرام قرار دے؟" (نیز دیکھئے ۷/۲۶ ؛ ۱۸/۳۱)۔ قرآنِ کریم نے جنت کی زندگی کو تمثیلی زندگی (IDEAL LIFE) قرار دیا ہے۔ دیکھئے! اس میں سامانِ زیبائش و آرائش کی کس قدر تفصیل دی گئی ہے۔

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۝ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ۝ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ۝ قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ۝ (۷۶/۱۲ ــــ ۱۶ و دیگر آیات)

یہ جنتی زندگی، ان کے استقلال و استقامت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس میں وہ بڑی آسائش و توانائی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ شادابیوں کے باغات اور حرارت بخش و حریت افزا فضائیں

اس میں وہ اقتدار و اختیار کی مسندوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ وہاں نہ سخت گرمی ہوگی نہ سخت سردی (ہمیشہ بہار کا موسم رہے گا)۔

چاروں طرف سے گھنے درختوں کے سائے ان پر جھکے ہوں گے اور ان کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوں گی۔ سامانِ زیست و راحت کی کوئی شے ان کی دسترس سے باہر نہیں ہوگی۔ اسے حاصل کرنے کے لئے انہیں جانکاہ مشقتیں نہیں اٹھانی پڑیں گی، بلکہ وہ خود ان کی طرف جھک کر آجائیں گی۔ چاندی کے برتنوں میں کھانے، بلوریں آبخوروں میں مشروبات۔ یہ سب ان کے گرد گردش کریں گے۔ خود چاندی کی چمک بلور جیسی ہوگی اور یہ سب برتن اور آبخورے ٹھیک ٹھیک اندازے اور پیمانے کے مطابق بنائے گئے ہوں گے۔

واضح رہے کہ اسلامی نظام میں یہ تمام اشیاء ہر ایک کو حاصل ہوں گی۔ کسی ایک طبقہ کو نہیں۔ جنت میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ اس میں امیروں اور غریبوں کے الگ الگ طبقات ہوں گے۔

۱۳۔ مذہبی آزادی کا حق۔ یعنی اس بات کا حق کہ انسان جس مذہب کو جی چاہے اختیار کرے اور جسے جی چاہے چھوڑ دے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲/۲۵۶)۔ اور اس مضمون کی دیگر متعدد آیاتِ قرآن میں موجود ہیں۔ ان کی پرستش گاہوں کی حفاظت بھی ان کا بنیادی حق ہے۔ سورۂ حج میں ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۗ (۲۲/۴۰)

اور اگر اللہ اس کا انتظام نہ کرتا کہ ایک گروہ کی روک تھام دوسرے گروہ کے ذریعے ہو سکے۔ (اور وہ سرکش لوگوں کو بدلگام چھوڑ دیتا کہ وہ جو جی میں آئے کرتے چلے جائیں) تو اور چیزیں تو ایک طرف (کسی قوم کی عبادت گاہ تک بھی دنیا میں محفوظ نہ رہتی۔ خانقاہیں، گرجے، یہودیوں کے معبد، مساجد جن میں خدا کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے ــ سب، کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے مرتد (اسلام چھوڑ کر کسی اور مذہب کو اختیار کر لینے) کی کوئی سزا نہیں۔ جب آزادیٔ مذہب اس کا بنیادی اصول ہے تو تبدیلیٔ مذہب کی سزا کیسی؟

۱۴۔ مظلوم کو فریاد کا حق۔ قرآنِ کریم میں ہے۔ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۗ (۴/۱۴۸) "اللہ کسی بُری بات کی تشہیر پسند نہیں کرتا، بجز مظلوم کے (جسے اس کا حق حاصل ہے کہ) اپنے اوپر ظلم اور زیادتی کی فریاد کرے۔

۱۵۔ اس بات کا حق کہ کوئی کسی دوسرے کی ذمہ داری کو نہیں اٹھائے گا۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۵) "جو کرے گا وہی بھرے گا اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔" اس کا بنیادی اصول ہے۔

ان کے علاوہ کچھ ایسے حقوق ہیں جو قانون کے دائرے کے اندر آتے ہیں۔

ان حقوق کے معنی یہ ہیں کہ کوئی ایسا قانون جو ان حقوق کو سلب کرتا ہو، خلاف قرآن ہوگا۔ نیز اگر کوئی نظامِ معاشرہ ان حقوق کو پورا نہیں کرتا تو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جا سکے گی۔

(۰)

پاکستان کے حوالہ سے ہم اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس وقت تک نہ ہماری مملکت اسلامی بن سکتی ہے نہ ہمارا دستور اسلامی مملکت کا دستور، جب تک ہمارے آئین میں ان بنیادی حقوقِ انسانیت کو شامل کرنے کے بعد یہ ضمانت بہم نہ پہنچائی جائے کہ

"چونکہ یہ بنیادی حقوق، انسان کو اللہ تعالیٰ نے تفویض فرمائے ہیں، اس لئے انہیں، کسی بھی حالات کے تحت، کسی وقت بھی، کوئی شخص یا ادارہ کبھی معطل یا منسوخ نہیں کر سکتا۔ یہ حقوق ہر فرد ملتِ پاکستانیہ کو ہمہ وقت حاصل رہیں گے۔"

اور پھر قرآن ہی کے منشار کے مطابق اگر ہم اسے پھیلا کر کہیں کہ اگر ان حقوق کا یقینی تحفظ عالمی طور پر انسان کے لئے ممکن بنا دیا جائے تو یہ زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ۝

اور حرفِ آخر کے طور پر ہم یہ واضح کر دینا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ کسی انسان کو کوئی حق بھی بھیک مانگنے سے نہیں ملا کرتا۔ اس کے لئے اپنے آپ کو اس قابل بنانا پڑتا ہے کہ کوئی آپ کی حق تلفی نہ کر سکے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کا طریقہ یہ بتایا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ ..... اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ..... (۸/۶۰)

ہم اس آیۂ جلیلہ کے متعلقہ حصہ کا مفہوم بھی محترم پرویز صاحب کے مفہوم القرآن ہی سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

"(لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاؤ اور سمجھ لو کہ مخالفین کو یونہی شکست ہو جائے گی۔ انہیں شکست تمہارے ہاتھوں ہی سے ملے گی) اس

لئے تم، دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رہو۔ امکان بھر سامانِ حفاظت فراہم کرو۔ اپنی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں سے مستحکم رکھو، تاکہ تم ان کے ذریعہ، ان لوگوں کو خائف رکھ سکو جو تمہاری ذات کے بھی دشمن ہیں اور نظامِ خداوندی کے بھی دشمن اور ان کے علاوہ، انہی جیسے اور دشمنوں کو بھی جن کا ابھی تمہیں علم نہیں ہوا۔ اللہ کو ان کا علم ہے۔"

ورنہ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں،

تقدیر کے قاضی کا یہ فتوےٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

حکیم محمد مسیح الدین صدیقی

قرآنی سیرتوں کو ڈھالئے

یہ سوچنا صحیح نہیں کہ دنیا بس مفتوح ہونے کے لئے تیار بیٹھی ہے' اسلام کی خوبیوں پر ایک وعظ اور اس پر ایمان لانے کے لئے ایک دعوت نامہ شائع ہونے کی دیر ہے' پھر ایشیا' یورپ' افریقہ' امریکہ سب مسخر ہوتے چلے جائیں گے۔ ایک تہذیب کا سقوط اس طرح اچانک نہیں ہوا کرتا کہ کل تھی اور آج ناپید ہو گئی اور دوسری تہذیب کا قیام بھی اس طرح واقع نہیں ہوتا کہ آج چٹیل میدان ہے اور کل کسی منتر کے زور سے ایک عالی شان قصر بن کر کھڑا ہو۔ گرنے والی تہذیب کے افکار' اصول' طریقے مدت ہائے دراز تک دلوں اور دماغوں پر' علوم و آداب پر اور تمدن و معاشرت پر اپنا اثر جمائے رہتے ہیں۔ اس اثر کا استحصال خود بخود نہیں ہو جاتا' کرنے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح گرنے والی تہذیب کے علمبردار بھی زوال پذیر ہونے کے باوجود سالہا سال تک زمین پر قبضہ جمائے رہتے ہیں' وہ خود جگہ چھوڑ کر نہیں ہٹ جاتے ہٹانے سے ہٹتے ہیں۔ لہٰذا نئی تہذیب پر نئی عمارت بنانا کوئی کھیل نہیں ہے کہ آپ سہولت سے بیٹھے رہیں اور وہ خود بن جائے۔ اس کام کے لئے ایک زبردست تنقیدی اور تعمیری تحریک کی ضرورت ہے جو ایک طرف علم و فکر کی طاقت سے پرانی تہذیب کی جڑیں اکھاڑ دے اور دوسری طرف علوم و فنون و آداب کو قرآن کی مخصوص فکری بنیادوں پر از سرِ نو مدوّن کرے۔ حتّٰی کہ ذہنی دنیا پر اس طرح چھا جائے کہ لوگ کتاب الٰہی کے طرز پر سوچنا اور محسوس کرنا شروع کریں۔ ایک طرف ان پرانے سانچوں کو مٹا دے جن پر انسانیت ڈھلا کرتی تھی اور دوسری طرف نئے سانچے تیار کرے جن سے قرآنی اخلاق اور قرآنی سیرتوں کے آدمی ڈھلنے لگیں' ایک طرف پرانے نظامِ تمدن و سیاست کو بزور مٹائے اور دوسری طرف ایک پورا نظامِ تمدن و سیاست قرآنی اصولوں پر عملاً قائم کرے۔

پس دنیا کو آئندہ دورِ ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ ہمارے یہاں کتابِ الٰہی موجود ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریہ پر سچا ایمان رکھتے ہوں۔ ان کو سب سے پہلے ایمان کا ثبوت

دینا ہوگا اور وہ صرف اسی صورت سے دیا جاسکتا ہے کہ وہ جس دینِ خالص کو تسلیم کرتے ہیں اس کے خود متبع بنیں، جس قرآنی ضابطہ پر ایمان لائے ہیں اس کے خود پابند ہوں، جس قرآنی اخلاق کو صحیح کہتے ہیں اس کا خود نمونہ بنیں، قرآن نے جس چیز کو فرض بتایا ہے اس کا خود التزام کریں اور جس چیز کو حرام کیا ہے اسے خود چھوڑیں۔ اس کے بغیر خود ان کی صداقت مشتبہ ہوگی، کجا کہ کوئی ان کے آگے سرِ تسلیم خم کرے پھر ان کو اس فاسد نظامِ تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہوگی، اس سے اور اس کے پیروؤں سے تعلق توڑنا ہوگا، ان تمام فائدوں، لذتوں، آسائشوں اور امیدوں کو چھوڑنا ہوگا جو اس نظام سے وابستہ ہوں اور رفتہ رفتہ ان تمام نقصانات، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا جو نظامِ غالب کے خلاف بغاوت کرنے اور نیا قرآنی نظام برپا کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔

(پندرہ روزہ "حق و باطل" ۱۶ مئی ۱۹۹۴ء)

القرآن

ہم نے یہ کتاب تم پر اس لئے نازل کی ہے کہ تم ان اختلافات کی حقیقت ان پر کھول دو جن پر یہ پڑے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب راہنمائی اور رحمت بن کر اُتری ہے ان لوگوں کے لئے جو اُسے مان لیں۔

شفیق و محترم معلّم

جناب علّامہ غلام احمد پرویزؒ کی یاد میں

جنہوں نے بھٹکی ہوئی قوم کے خفتہ شعور کو بیدار کیا۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے سلسلہ میں دورِ حاضر کا مؤرخ سرسیدؒ، علّامہ اقبالؒ اور علّامہ غلام احمد پرویزؒ کی خدمات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسلام کے متعلق جدید تعلیمیافتہ طبقے کے شکوک و شبہات کو دُور کرنے میں جناب پرویز صاحب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ قرآنِ حکیم کی غیر متبدّل تعلیمات، علّامہ اقبالؒ کی توضیحات اور جناب پرویزؒ کی تشریحات نوجوانوں کی فکر میں جلا پیدا کرتی ہیں۔ انفرادی اور گھریلو مسائل سے لے کر معاشی، معاشرتی، سیاسی، اخلاقی، تعلیمی اور دینی معاملات کے میدان میں شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر محترم پرویزؒ صاحب نے قرآنِ حکیم کی روشنی میں سیر حاصل بحث نہ کی ہو۔ اس عظیم مفکرِ قرآن نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قرآنِ مجید پر غور و فکر میں گذارا اور اس کا حاصل بہت ہی مؤثر اور شگفتہ انداز میں ملّتِ اسلامیہ کے سامنے پیش کیا۔ ۹، جولائی ان کی پیدائش کا دن ہے۔ اس لئے طلوعِ اسلام اپنے اس شمارہ میں ان کا فکر انگیز مقالہ "گذرگاہِ خیال" کے عنوان سے شائع کر رہا ہے تاکہ قارئین ان حالات و واقعات سے آگاہی حاصل کر سکیں جن سے گذر کر محترم پرویزؒ صاحب اس بلند مقام پر پہنچے۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصّۂ پارینہ را

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گزرگاہِ خیال

میرا سفینۂ حیات، متعدد جوئباروں اور متنوع آبناؤں سے گذر کر اس مقام تک پہنچا ہے۔ میری پیدائش [1] ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو شریعت اور طریقت کا نہایت نظیف و لطیف آمیزہ تھا۔ گھر کے اسی ماحول کی نسبت سے میں اکثر (استعارۃً) کہا کرتا ہوں کہ میری پیدائش پر، اگر میرے ایک کان میں اذان کی ندائے جانفزا پہنچی تھی تو دوسرے میں قوالوں کی آواز میں، امیر خسرو کے "قول قلبانوں" کی نشید روح افروز۔ (میرے والد مرحوم تو ناخواندہ تھے لیکن) میرے دادا، (مولوی چوہدری رحیم بخشؒ) حنفی مسلک کے ایک جید عالم اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ممتاز بزرگ تھے۔ علاوہ ازیں، وہ ایک ماہر طبیب بھی تھے لیکن انھوں نے ان میں سے کسی خصوصیت کو بھی ذریعۂ معاش نہ بنایا، کہ وہ نوعِ انسان کی طبیعی یا روحانی اصلاح یا امداد کا معاوضہ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ چونکہ وہ مجھے اپنے علم و سلوک کا وارث بنانا چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے شروع ہی سے مجھے اپنے آغوش میں لے لیا اور میری پرورش، تربیت اور تعلیم انہی کے ہاتھوں یا زیرِ نگرانی ہوئی۔ فطرت کی گرم گستری سے ذہن رسا پایا تھا اس لئے علومِ شریعت و طریقت کے مبادیات پر تھوڑے سے عرصہ میں عبور حاصل کر لیا۔ دادا جان، سلوک کی منازل بھی ساتھ

---

[1] چونکہ میں یہاں اپنے سوانح حیات پیش نہیں کر رہا اس لئے میں اپنے آپ کو انہی واقعات تک محدود رکھنا چاہتا ہوں جن کا تعلق موضوعِ زیرِ نظر سے ہے۔ ویسے میری پیدائش ۹۔ جولائی ۱۹۰۳ء کو (موجودہ مشرقی پنجاب کے) ضلع گورداسپور کے قصبہ بٹالہ میں ہوئی تھی، جو مختلف خصوصیات کی بنا پر ایک مشہور بستی تھی۔

کے ساتھ طے کرائے جاتے تھے اس لئے مراقبات، مجاہدات، ریاضات (چلّہ کشیاں اور زاویہ نشینیاں) اس ع
میرے معمولات بن چکے تھے جس میں بچے ہنوز "گلی ڈنڈا" کھیلا کرتے تھے۔ میرے ہمعصر پتنگیں اڑایا کرتے تھے اور
"آنسوئے افلاک" کے حقائق و معارف سمجھنے میں محو ہوتا تھا۔ اس ضمن میں ایک بات بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ میں اکث
کرتا ہوں کہ بعض "اتفاقات" کس طرح ایک فرد کی زندگی کے مستقبل کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ محض حسنِ ا
تھا کہ دادا جان کا تعلق تصوف کے چشتیہ نظامیہ سلسلہ سے تھا جس میں موسیقی کو جزوِ عبادت سمجھا جاتا ہے۔ اس سے
نغمہ سے متعلق میرے ذوقِ لطیف کی از خود نشوونما ہوتی گئی۔ اگر ان کا تعلق (مثلاً) قادریہ یا نقشبندیہ سلسلہ سے ہو
میرے اس ذوق کا دم گھٹ جاتا اور نہ معلوم پھر یہ تسکین نایافتہ تقاضے کس کس قسم کے نفسیاتی معاذیر کے جھرونکوں سے
جھانکتے اور "شرعی تاویلوں" کے روزنوں سے سر نکالتے۔

بٹالہ ایک متشدد قسم کا مذہبی قصبہ تھا۔ آبادی کی اکثریت تو حنفی المسلک سنّیوں پر مشتمل تھی لیکن اہلِ حدیث
اہلِ تشیع بھی خاصی مؤثر حیثیت رکھتے تھے۔ اس زمانے میں قادیان جانے کے لئے بٹالہ ہی ریلوے اسٹیشن تھا۔ ا
لئے وہاں کے زائرین کے لئے یہ قصبہ ناگزیر گذرگاہ تھا۔ علاوہ ازیں، یہ عیسائی مشنریوں کا مرکز اور آریہ سماج کا بھی گڑھ
اس زمانے میں بین الفرق مناظروں اور بین المذاہب مباحثوں کا بڑا زور تھا۔ اس لئے، جس طرح دریا کے کنارے بسنے
کے بچے پیدائشی تیراک ہوتے ہیں، بٹالہ کے مذہب پرست طلبا پیدائشی مناظر ہوتے تھے۔ فضا کے ان تقاضوں کی وجہ
مختلف فرقوں اور مذہبوں کے تقابلی مطالعہ کی ضرورت لاحق ہوئی۔ دادا جان کو ان سب کے لٹریچر پر کافی عبور حاصل تھ
(اور تو اور، وہ سنسکرت کے بھی عالم تھے) اس لئے میں ان وادیوں سے بآسانی گزرتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی میر
انتہائی خوش بختی تھی کہ وہ اس قدر مذہبی شخصیت ہونے کے باوجود، بڑے روشن خیال اور وسیع الظرف واقعہ ہوئے
تھے۔ ابتداءً وہ انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ اس زمانے میں اس زبان کا جاننا کس قد
ضروری ہے، تو انھوں نے کافی بڑی عمر میں تھوڑے سے عرصہ میں اس میں بھی خاصی استعداد حاصل کرلی۔ مجھے
اس کا یہ فائدہ ہوا کہ انھوں نے میری اسکول کی تعلیم کو بھی نظر انداز نہ ہونے دیا۔ انہی مؤثرات و عوامل کا نتیجہ تھا کہ میٹرک
تک پہنچتے پہنچتے، میری نگاہ کی مشرقی اور مغربی افقیں کافی وسیع ہو چکی تھیں —— اور ان کے ساتھ ہی "باطنی علوم"
کی گہرائیاں بھی کافی عمیق۔

تصوّف کا "ہمہ اوست" انسان کو وسیع المشرب بنا دیتا ہے —— اگرچہ اکثر اوقات کچھ ضرورت سے زیادہ ہی
وسیع المشرب —— اس وسیع المشربی کا نتیجہ تھا کہ میں جس جذب و شوق سے میلاد کی محفلوں میں شریک ہوتا

سی سوز و گداز کے ساتھ عزاداری کی مجلسوں میں بھی حاضری دیتا تھا[1] اور قوالی تو خیر تھی ہی جزوِ عبادت۔ اس قسم
اضداد کا مجموعہ تھا میرے بچپن اور ابتدائے شباب کا زمانہ۔

لیکن میں نے ابھی فطرت کی اس نوازشِ خصوصی کا ذکر نہیں کیا جس نے میری زندگی کے دھارے کا رُخ بدل دیا۔
نے ذوقِ سلیم اور ذہنِ رسا کے ساتھ مجھے تنقیدی نگاہ بھی عطا کی تھی۔ غالب نے کہا تھا کہ

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا

عشق کے متعلق تو میں کہہ نہیں سکتا، تنقیدی نگاہ کے متعلق اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس سے درد پیدا ہوتا ہے
دوا' اور پھر یہی دردِ لا دوا' دنیا کے ہر درد کا مداوا بن جاتا ہے۔ یہی وہ جنسِ گراں مایہ ہے۔ (کم از کم میرے حق میں تو
یسی ہی ثابت ہوتی ہے) جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ گوہرِ ہر سود در جیبِ زیاں انداختہ

اب نے یہ بھی کہا تھا کہ

گر عشق نبودے و غمِ عشق نبودے ایں ہما سخنِ نغز، کہ گفتے، کہ شنودے

بھی اس کی ہمنوائی میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے یہ تنقیدی نگاہ نہ ملتی، تو میری ساری متاعِ حیات "یوسف
قیمتِ اوّل خریدہ" سے زیادہ کچھ نہ ہوتی۔ میں نہ کوئی "سخنِ نغز" کہہ سکتا، نہ سن سکتا۔

میں پہلے، اِس کانٹے کی اُس کھٹک کی طرف آتا ہوں، جس کا درد اس زمانے میں لا دوا تھا۔ میں ایک دن تفسیر دیکھ
رہا تھا۔ سورۃ احزاب کی یہ آیت میرے سامنے تھی۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَكُونُوا۟ كَٱلَّذِينَ ءَاذَوْا۟ مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ ٱللَّهُ مِمَّا قَالُوا۟ ...... (۳۳/۶۹)

اَے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا، جنھوں نے موسیٰؑ کو (طرح طرح کی باتیں کرکے)
ستایا لیکن خدا نے ان تمام باتوں سے اس کی بریت کر دی۔

بات کچھ ایسی دقیق نہ تھی۔ قرآنِ مجید کے مختلف مقامات میں تفصیل سے درج ہے کہ بنی اسرائیل کس طرح حضرت موسیٰؑ

[1] ویسے بھی صوفی، آدھا شیعہ ہوتا ہے۔

کو تنگ کرتے اور بات بات پر بگڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس سے حضرت موسیٰؑ کا تو کچھ نہ بگڑا، خود وہ قوم معتوب
نعمائے خداوندی سے محروم ہو گئی لیکن اس کی تفسیر میں مجھے یہ لکھا ہوا ملا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ بڑے حیادار تھے۔ اس طرح جسم کو چھپائے رکھتے تھے کہ اس کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بنی اسرائیل نے انھیں ستانا شروع کیا اور کہا کہ یہ اس قدر جو اپنے بدن کو چھپائے رکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو برص یا اس قسم کی کوئی اور بیماری ہے۔ اللہ نے چاہا کہ (حضرت) موسیٰؑ کو ان کی تہمت سے بری کرے۔ سو موسیٰؑ ایک دن تنہائی میں اپنے کپڑوں کو پتھر پر رکھ کر غسل کرنے لگے۔ جب فارغ ہوئے اور اپنے کپڑے لینے کے لئے اس کی طرف بڑھے، تو پتھر ان کے کپڑوں سمیت بھاگا۔ موسیٰؑ لٹھ لے کر اس کے پیچھے دوڑے، یہ کہتے ہوئے کہ اے پتھر! میرے کپڑے، اے پتھر! میرے کپڑے۔ یہاں تک کہ وہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ تک پہنچ گئے۔ انھوں نے انھیں (حضرت موسیٰؑ) کو برہنہ دیکھ لیا اور ان پر واضح ہو گیا کہ وہ ساخت میں سب سے بڑھ کر حسین تھے۔ اس طرح اللہ نے ان کے الزام سے موسیٰؑ کو بری کر دیا۔ اس جگہ پہنچ کر پتھر رک گیا۔ موسیٰؑ نے اپنے کپڑے لیکر پہن لئے۔ پھر پتھر کو لٹھ سے مارنے لگے۔ اللہ کی قسم، اس پر ان کی لاٹھی کے نشانات ہیں تین یا پانچ۔ (جامع ترمذی و بخاری)

مجھے جھنجھنی آگئی اور میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ دل میں طرح طرح کے شکوک ابھرنے لگے لیکن جب یہ خیال آیا کہ یہ تو نبی اکرمؐ کی ارشاد فرمودہ تفسیر ہے، تو کپکپا اٹھا۔ گڑگڑا کر توبہ کی اور شیطان سے پناہ مانگی جو اس قسم کے وساوس پیدا کر رہا تھا لیکن اس کے بعد کیفیت یہ ہو گئی کہ تفسیر کا کوئی سا ورق الٹا، اس پر اسی قسم کی تفسیری روایات دکھائی دیں۔ اس کشمکش میں جو کچھ میرے دل پر گزر رہی تھی، اسے کسی سے بیان نہیں کر سکتا تھا، نہ قرآنِ پاک تفسیر چھوڑ سکتا تھا، نہ اس پر اختیار تھا کہ اس سے دل میں اس قسم کے شکوک اور وساوس پیدا نہ ہوں۔ شکوک پیدا ہونے کے ساتھ ہی دل میں یہ خیال ابھرتا کہ رسول اللہؐ کی بیان فرمودہ تفسیر، اور اس کے خلاف شکوک! معاذ ثم معاذ اللہ۔

ایک دن بخاری شریف دیکھ رہا تھا، تو اس میں اس روایت پر نگاہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ سلیمان بن داؤد (علیہما السلام) نے ایک روز کہا کہ آج شب کو میں سو عورتوں کے پاس

یا ننانوے عورتوں کے پاس جاؤں گا۔ وہ سب عورتیں ایک ایک شاہسوار پیدا کریں گی جو خدا کی راہ میں جہاد کرے گا۔ ان کے ایک ہم نشین نے ان سے کہا کہ "انشاء اللہ" کہو، مگر انھوں نے "انشاء اللہ" نہ کہا۔ پس ان میں سے صرف ایک عورت حاملہ ہوئی اور وہ بھی آدھا بچہ جنی۔ قسم ہے کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، اگر وہ "انشاء اللہ" کہہ لیتے تو سب عورتوں کے بچے پیدا ہو جاتے اور وہ سب شہسوار ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے۔ (بخاری۔ کتاب الجہاد)

"اصح الکتب بعد کتاب اللہ" میں یہ حدیثِ رسول!! سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں، اور کہاں جاؤں گا ــــ؟ دل میں کشمکش کی آگ اور تیزی سے بھڑک اٹھی۔ تفاسیر میں وہ کچھ دیکھتا تو کتاب اللہ (قرآنِ مجید) کے متعلق طرح طرح کے خیالات اُبھرنے شروع ہو جاتے۔ احادیثِ مقدسہ میں یہ کچھ دیکھتا تو جگر شق ہو کر رہ جاتا۔ ان کے بعد کتبِ فقہ سامنے آئیں تو ان میں ایسے ایسے "مسائل" لکھے ملتے جن کا، اس زمانے میں تو ایک طرف، اس وقت بھی کسی محفل میں تذکرہ نہیں کر سکتا ــــ یہ تھی میری اضطراری کیفیت، لیکن مشکل یہ تھی کہ جو کچھ دل پر بیت رہی تھی، اسے زبان تک لا نہیں سکتا تھا۔ اُس ماحول میں ایک انجانا خوف تھا جو دل و دماغ پر بُری طرح چھا رہا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد ہوا یہ کہ میں ان کُتبِ مقدسہ کو اٹھاتا اور انھیں چوم کر پھر اسی طرح رکھ دیتا۔

یہ آتشِ خاموش میرے دل میں سلگ رہی تھی کہ تاریخ نے اسے شعلۂ جوالہ میں بدل دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ــ اور یہ کانٹے وہ ہیں کہ جن کی چبھن کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی ــــ کہ محرم قریب آرہا تھا۔ سنیّوں کی مسجدوں اور شیعہ حضرات کے امام باڑوں میں محافل و مجالس کا انعقاد شروع ہو گیا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، میں ان تقاریب میں بڑے احترام و عقیدت سے شامل ہوا کرتا تھا۔

بخاری شریف میں ایک حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری اُمّت کا پہلا لشکر جو قسطنطنیہ پر حملہ کرے گا، وہ بخشا جا چکا ہے ــــ مغفورٌ لہم ــــ حدیث تو یہ پہلے معلوم تھی، تاریخ میں کیا دیکھتا ہوں کہ جس لشکر نے پہلے پہل قسطنطنیہ پر حملہ کیا، اس کا سپہ سالار یزید ابنِ معاویہ تھا، اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ اور خود امام حسینؓ اس میں سپاہی (مجاہد) کی حیثیت سے شریک تھے۔

یزید، اور اس لشکر کا سپہ سالار، جس کی مغفرت کی بشارت و ضمانت رسولؐ اللہ نے دی تھی! یقین مانئے، پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ــــ سر چکرا گیا ــــ اس وقت اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ میں نہ سنیّوں کی محفل میں شریک ہوا، نہ شیعوں کی مجلسوں میں۔ تنہا خاموش بیٹھا رہتا، اور کبھی کبھی بے ساختہ پکار اٹھتا کہ

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

لیکن نہ اس "دلِ شوریدہ" پر کسی کو رحم آتا تھا نہ اس تمنا پر جو اس بھنور میں طلسمِ پیچ و تاب بن رہی تھی! میری وہ جنت چھن رہی تھی جس نے میرے دل و دماغ کو بچپن سے پربہار بنا رکھا تھا۔ میرا وہ سکون برباد ہو رہا تھا جسے میں نے برسوں کی حسین آرزوؤں اور مقدس دعاؤں سے حاصل کیا تھا اور اس کی جگہ حالت یہ تھی کہ

مرا درد ہست اندر دل، اگر گویم زباں سوزد
اگر دم در کشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

لے دے کے "ذکر و فکرِ صبحگاہی" (تصوف) کا پیدا کردہ ایک سرور تھا، سو میری حرماں نصیبی (اور اب سمجھتا ہوں کہ خوش بختی) کہ وہ بھی "نذرِ برہمن" ہو گیا۔ تفصیل اس غارت گریٔ بہارِ چمن" کی دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔

دادا جان کے ہاں عام طور پر سرِ شام، شہر کے اچھے اچھے دانشور آتے اور مختلف علمی اور فکری موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ لیکن رات ڈھلے ایک اور محفل جمتی جو پُر اسرار سی ہوتی۔ اس میں دور دراز کے سادھو، سنیاسی، یوگی آتے اور موضوع ویدانت اور ہمہ اوست کے رموز و اسرار ہوتے۔ تصوف کا انتہائے کمال، کرامات سمجھا جاتا ہے اور انہی کرامات (اور ان کے تذکروں) سے حضرات اولیاء کرام کی عظمت و عقیدت (بلکہ ہیبت) دلوں میں جاگزیں ہوتی ہے۔ پھر تصوف کو "مغزِ دین" کہا جاتا ہے اور منتہائے اسلام۔ وہ یوگی، سنیاسی آتے تو ان سے لامحالہ صوفیائے کرام کے کشف و کرامات کے تذکرے چھڑتے، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہتی جب میں دیکھتا کہ بعض یوگی، ان سے بھی کہیں زیادہ تحیر انگیز اور تعجب خیز "کرامات" دکھا دیتے۔ اس سے میرے دل میں یہ خیال ابھرتا کہ اگر ہمارے اولیاء کرام کی کرامات، دین کا عصارہ اور قربِ خداوندی کا نتیجہ ہیں، تو یہ بت پرست، مشرک، یوگی، ان سے بھی زیادہ حیرت فروش "کرامات" کیسے دکھا دیتے ہیں؟ کتبِ تصوف میں اس کا جواب زیادہ سے زیادہ یہ ملتا کہ اولیاء کرام کی کرامات، کرامات کہلاتی ہیں، اور ان مشرکین کی شعبدہ بازیاں، استدراج، لیکن یہ لفظی تفاوت میرے لئے وجہِ تسکین نہ بن سکتا۔ اس طرح رفتہ رفتہ میرا وہ سکون بھی چھنتا چلا گیا، جسے حاصل کرنے کے لئے میں نے اپنی صحت تک قربان کر دی تھی۔ (اس کے اثرات عمر بھر میرے ساتھ رہے۔ اب بھی اسی طرح موجود ہیں۔ مجھے صحت مند زندگی کبھی نصیب نہیں ہوئی!)

کبھی کبھی جی میں آتا کہ ان شکوک و شبہات کا (جن کی آماجگاہ میرا قلب حزیں بن رہا تھا اور جن کی وجہ سے میرا دن کا چین اور راتوں کی نیند مجھ پر حرام ہو رہی تھی) دادا جان سے تذکرہ کروں، لیکن (میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ شدتِ احترام و

عقیدت کا نتیجہ تھا یا ان کے علوِّ مرتبت کی عظمت کا احساس) میں اپنے اندر اس کی جرأت نہیں پاتا تھا۔ میں اُسے ڈر بھی نہیں کہہ سکتا، ہیبت بھی نہیں — وہ تو بڑے ہی محبت کرنے والے شفیق تھے — لیکن کچھ تھا جس کی وجہ سے ایسا کہنا تو ایک طرف، میں ان کے دل میں اس کا احساس تک بھی پیدا ہونے نہیں دینا چاہتا تھا کہ میرے دل میں اس قسم کے شکوک ابھر رہے ہیں — اور پھر ابھی میری عمر بھی کیا تھی!

میں اس داستانِ تپش و خلش کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا اور اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ میرے قلب و دماغ کی یہ اضطراری کیفیت برسوں تک رہی، تا آنکہ مجھے بصیغۂ ملازمت لاہور آنا پڑا۔ یہ تبدیلی میرے حق میں آیۂ رحمت ثابت ہوئی۔ اس سے میری زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہو گیا۔ اس فضا میں مجھے زیادہ آزادی سے سوچنے کا موقعہ مل گیا۔ یہ آج سے پچاس سال پہلے کی بات ہے۔

علامہ اقبالؒ سے میرا ذہنی تعارف بہت پہلے ہو چکا تھا۔ وہ یوں کہ جب ان کی مثنوی — اسرارِ خودی — شائع ہوئی، تو دادا جان نے مجھے خصوصیت کے ساتھ اسے پڑھایا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ وہ چھوٹی تقطیع کے نفیس کاغذ پر بڑے خوبصورت انداز میں چھپی تھی اور دادا جان کے پاس جو نسخہ تھا، اس پر علامہ اقبالؒ کے دستخط ثبت تھے۔ اس وقت تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ جس کتاب پر مصنف کے دستخط ثبت ہوں، اس کا مطلب کیا ہوتا ہے لیکن اب اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علامہ نے وہ نسخہ دادا جان کو تقدیماً ارسال فرمایا تھا اور ان کے باہمی روابط تھے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ جب میں لاہور آنے لگا تو انھوں نے (دادا جان نے) لاہور میں دو "بزرگوں" سے ملنے کے لئے فرمایا تھا۔ ایک امام الدین بخاری، جو نواں کوٹ میں رہتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ وہ لاہور کے قطب ہیں اور دوسرے علامہ اقبالؒ — بہرحال، بات اس مثنوی کی ہو رہی تھی۔ اس کے اُس (پہلے) ایڈیشن، میں حافظ کے متعلق وہ اشعار بھی تھے، جن کی بنا پر، ملک بھر کے متصوفین نے علامہ کے خلاف طوفان برپا کر دیا تھا۔ اس بحث و نزاع میں علامہ نے "عجمی اسلام" یا اسلام پر عجمی اثرات کا بار بار ذکر کیا تھا — اور یہ بات میرے دماغ کے ساتھ چپک گئی تھی۔ لاہور کی نسبتاً آزاد فضا میں میرے دل میں اس تجسس کا جذبہ بیدار ہوا کہ معلوم کیا جائے کہ حقیقی اسلام اور عجمی اسلام میں کیا فرق ہے اور وہ عجمی اثرات کیا تھے جن سے حضرت علامہ نے اس طرح متنبّہ کیا تھا۔ یہاں سے تحقیقات کا ایک نیا باب میرے سامنے کھل گیا۔ یہ تحقیق یکسر آزادانہ تھی کیونکہ "سابقہ اسلام" کی اندھی عقیدت ان شکوک و شبہات نے ختم نہیں تو دھندلی ضرور کر دی تھی جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ میں نے قریب دس سال کا عرصہ ان سنگلاخ زمینوں اور خار دار جھاڑیوں میں گذارا، اور ان موضوعات سے متعلق جو کتابیں بھی مجھے دستیاب ہو سکیں، انھیں چاٹ ہی نہیں لیا، ہضم کر ڈالا۔ مجھے اس حقیقت کے اعتراف و اعلان

میں کوئی باک یا تأمل نہیں کہ اس زمانے میں، سابقہ معتقدات میں سے کسی پر بھی میرا یقین باقی نہیں رہا تھا۔ یوں کہیئے کہ میں اس زمانے میں لاؔ کی منزل سے گزر رہا تھا اور الاّ ہنوز میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ ان حالات میں عین ممکن تھا کہ میں اسلام ہی سے برگشتہ ہوجاتا لیکن (میری انتہائی خوش بختی کہ) اس ورطۂ لاؔ میں ایسا جاذبہ موجود رہا جوان تلاطم خیزیوں میں، میری کشتی کا لنگر بن گیا اور وہ جاذبہ تھا حضور نبیٔ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے ساتھ میری بے پناہ عقیدت، ہی نہیں محبت میرا ایمان تھا کہ ایسی عظیم ہستی جس نے انسانوں کی داخلی اور خارجی دنیا میں ایسا محیّر انگیز انقلاب برپا کردیا تھا، نہ تو (معاذ اللہ) فریب خوردہ ہوسکتی ہے نہ فریب کار۔ اس لئے جب آپ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید نہ میری، نہ کسی اور انسان کی فکری تخلیق ہے بلکہ یہ خدا کا کلام ہے تو مجھے اس دعویٰ کو یوں ہی نہیں جھٹک دینا چاہیئے انتظار کرنا چاہیئے تاآنکہ میں قرآن کو خود سمجھنے کے قابل ہوجاؤں۔ بس یہ تھا ایک سہارا (اور کس قدر محکم سہارا) جس نے مجھے ان طوفانوں میں تھامے رکھا اور میرے پاؤں میں لغزش نہ آنے دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے کم کشش کی کوئی قوت مجھے اس ورطہ میں سنبھال نہیں سکتی تھی۔ سچ ہے۔

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو　　عشق خود اِک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

کس قدر احسانِ عظیم ہے اس ذرۂ ناچیز پر اس آفتابِ عالم تاب کا، جس کی رحمۃ اللعالمینی کے تصدّق مجھے منزل ملی، مقام ملا، مدعا ملا۔

کوثر چکد از لبم، بایں تشنہ لبی　　خاور دمد از شبم، بایں تیرہ شبی

اے دوست ادب، کہ در حریمِ دلِ ماست　　شاہنشہِ انبیاء، رسولِ عربی

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا

عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (۳۳/۵۶)

برسوں کی تحقیق و کاوش کے بعد یہ حقیقت میرے سامنے آگئی کہ ہمارا مروّجہ اسلام جن عناصر کا مجموعہ ہے، وہ کہاں کہاں سے مستعار لئے گئے اور کس طرح جزوِ اسلام (بلکہ عینِ اسلام) بن گئے ہیں۔ (ضمناً) میرے تصنیفی پروگرام میں یہ بھی شامل ہے کہ میں ان تحقیقات کی روشنی میں اسلام کی، (مسلمانوں کی نہیں، اسلام کی) تاریخ مرتب کروں، جس میں یہ بتایا جائے کہ حقیقی اسلام کس طرح مروّجہ اسلام میں تبدیل ہوگیا لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب میں قرآن مجید کے متعلق اپنے پیشِ نظر پروگرام سے فارغ ہوگیا کہ اُسے ہر دوسرے کام پر تقدّم و تفوّق حاصل ہے۔ بہرحال، اس تاریخ کی ہلکی سی جھلک اس کتاب کے آخری باب میں آپ کے سامنے آئے گی۔

میری عمر بھر کی تحقیق و کاوش کا ماحصل یہ ہے کہ:

(۱) جو دین، نبی اکرمؐ کی وساطت سے، منجانب اللہ ملا تھا، وہ بتمام و کمال، قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔

(۲) دین کے معاملہ میں حق و باطل اور صحیح اور غلط کا معیار قرآنِ کریم ہے۔ روایات ہوں یا تاریخ۔ شریعت ہو یا طریقت، غرضیکہ جو کچھ بھی اسلام کے نام سے ہمارے ہاں مروج ہے، ضرورت ہے کہ اسے قرآن کی کسوٹی پر پرکھ لیا جائے۔ جو اس پر پورا اُترے اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے، جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔ یہ دعویٰ کہ ہمارے ہاں جو کچھ متوارث چلا آرہا ہے، ہمارے اسلاف نے اسے بہرحال قرآن کی کسوٹی پر پرکھ لیا ہوگا، ہمیں بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا۔ قرآن کا مطالبہ یہی ہے کہ تم خود غور و فکر کے بعد، ردّ و قبول کا فیصلہ کرو۔

(۳) اسلام مذہب نہیں، دین ہے جو صرف مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت میں عملی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ اس مملکت کا فریضہ، قرآنی احکام و اقدار کو، عملاً نافذ کرنا ہوگا۔

(۴) قرآنی مملکت ــــ محض قوانین کے میکانکی نفاذ سے وجود میں نہیں آجاتی۔ اس کے لئے ایسی جماعت (امت) کی ضرورت ہوتی ہے جس کے افراد کی زندگی قرآنی اقدار کے قالب میں ڈھلی ہو۔ حضورؐ نے اپنی فقید المثال تعلیم اور عدیم النظیر تربیت سے ایک جماعت تیار فرمائی اور ان کی رفاقت سے قرآنی مملکت کی بنیاد رکھی۔ حضورؐ کا یہی عمل ہے جو قیامت تک نوعِ انسان کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار پاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس اسوۂ حسنہ کو سامنے لانے کے لئے حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔ اس مقصد کے لئے جب میں نے کتبِ روایات و تاریخ کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ وہ اس قسم کے قصے کہانیوں سے بھری پڑی ہیں جو نہ صرف خلافِ علم و عقل اور خلافِ قرآن ہیں بلکہ ان سے حضورؐ کی سیرت بھی داغدار ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف میں نے جب قرآن مجید پر غور کیا تو دیکھا کہ اس میں حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے اصولی گوشے محفوظ ہیں۔ میں نے ان اصولوں کو عنوان قرار دیا اور ان کی روشنی میں کتبِ روایات و آثار کو کھنگالا۔ ان میں جو واقعات قرآن کے مطابق نظر آئے، انھیں قبول کر لیا جو اس کے خلاف دکھائی دیے انہیں مسترد کر دیا۔ اس طرح حضورؐ کی نکھری، اجلی، مصفّا، پاکیزہ سیرت مرتب ہو کر سامنے آگئی جو معراجِ انسانیت کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ للہ الحمد کہ میری اس محنت کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن یہ سن کر آپ حیران ہوں گے کہ ہمارے قدامت پرست طبقہ نے اس کی بھی مخالفت کی۔ ان کی وجوہِ مخالفت میں سے میں اس

موقع پر صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ ہمارے یہ عقیدہ ایک مسلّمہ کی حیثیت سے مروج چلا آرہا ہے کہ حضورؐ کے ساتھ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال خصتی کے وقت نو سال کی۔ مخالفین کی طرف سے اس پر جس قدر اور جس نہج سے اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ قطع نظر ان کے اعتراضات کے، یہ چیز خود قرآنِ کریم کے بھی خلاف ہے کیونکہ قرآن نے بلوغت کو نکاح کی شرط قرار دیا ہے۔ بنابریں، میں اس خیال کو ذہن کے پاس بھی پھٹکنے نہیں دے سکتا تھا کہ یہ واقعہ صحیح ہوگا۔ میں نے جب اس کے متعلق تحقیق سے کام لیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر انیس سال کے قریب تھی۔ اس پر مجھے جس قدر مسرّت حاصل ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ ہمارے مذہبی حلقہ کی طرف سے اس پر صدائے تحسین بلند ہوگی کہ معاندین کے جس اعتراض کا ان سے کوئی معقول جواب بن نہیں پڑتا تھا۔ تحقیق سے ثابت ہوگیا کہ وہ واقعہ ہی غلط ہے لیکن ان حضرات نے اس کی سخت مخالفت کی۔ دلیل یہ تھی کہ اگر اس تحقیق کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے بخاری شریف کی اس روایت کو غلط قرار دینا پڑے گا جس میں حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح چھ سال کی بتائی گئی ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ان حضرات کے نزدیک قرآن اور صاحبِ قرآن کی حیثیت کیا ہے اور کتبِ روایات و تاریخ کا مقام کیا ہے اور اسی سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ جو شخص کتبِ روایات و تاریخ کی تحقیق و تنقیح کا مشن لے کر اٹھے، ان کی طرف سے اس کی کس قدر مخالفت ہوگی۔ میرا یہی وہ جرم ہے جس کی بنا پر میرے خلاف، ایک ہزار "علماءِ کرام" نے کفر کا فتویٰ عائد کیا تھا، اور ہر محراب و منبر سے میرے خلاف مسلسل پراپیگنڈہ جاری ہے، جو یکسر جھوٹے الزامات پر مبنی ہوتا ہے۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے اپنی بے مثال تعلیم و تربیت سے قدسیوں کی ایک جماعت تیار فرمائی ان کی رفاقت سے قرآنی مملکت کی بنیاد رکھی۔ آپؐ کی دنیا سے تشریف براری کے بعد، اس مملکت کی سربراہی حضرت صدیقِ اکبرؓ کو تفویض ہوئی لیکن ایک تو ان کا زمانۂ خلافت بہت مختصر تھا (قریب اڑھائی سال) اور دوسرے ملک کے اندر مختلف بدوی قبائل نے جو شورش برپا کی تھی، آپ کا زیادہ وقت اس کے فرو کرنے میں صرف ہوگیا۔ بنابریں، اس نظام کی تکمیل ان کے عہد میں بھی نہ ہوسکی؛ اگرچہ جو فریضہ انھوں نے ادا کیا (یعنی استحکامِ مملکت) وہ بجائے خویش بڑا وقیع اور مستحق ہزار تبریک و تحسین ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانی معاشرہ (یا نظامِ مملکت) کے لئے جو اصول بیان کئے ہیں۔ وہ

تو واقعی بڑے بلند ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان پر کبھی عمل ہو بھی سکا ہے اور اگر کبھی ان پر عمل ہوا بھی تھا تو وہ سلسلہ آگے کیوں نہ چلا؟ ہمارے ہاں اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ان پر خلافتِ راشدہ کے زمانے میں عمل کیا گیا تھا جب صحیح اسلامی مملکت قائم ہوئی تھی لیکن جب وہ کہتے ہیں کہ اس نظام یا مملکت کی تفصیل بتایئے تو ہماری تاریخ اس کا جو نقشہ پیش کرتی ہے اس کا مثالی ہونا تو ایک طرف، اسے دیکھ کر خود ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ میں نے اپنی تحقیق و تجسس کا ایک معتدبہ حصہ اس کے لئے بھی وقف کیا کہ کسی طرح اس نظام کا صحیح نقشہ سامنے آجائے۔ یہ نقشہ مجھے حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ملا۔ کتبِ تاریخ و روایات میں اس کے متعلق بھی ہر قسم کا رطب و یابس مخلوط ملتا ہے، لیکن میں نے جب اسے اپنے مسلک (یعنی قرآنی معیار) کے مطابق چھانا پھٹکا تو یہ اپنی منزّہ شکل میں سامنے آگیا۔ اسی سے میں اسلام کو بہ حیثیتِ دین (عملی نظامِ حیات) سمجھ سکا۔ اس سے مجھے جس قدر مسرت و اطمینان حاصل ہوا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ نقشہ میرے سامنے تو ایک مدت ہوئی آچکا تھا، لیکن اسے دوسروں کے سامنے لانے میں ایک خاص اَمر دامن کش تھا۔ یہ نظام حضرت عمرؓ کی سربراہی میں صحابہ کبارؓ کے ہاتھوں متشکل ہوا تھا، اور صحابہؓ کے بارے میں مسلمانوں کے دو بنیادی گروہوں ـــــ شیعہ اور سنّی ـــــ میں جو اختلاف ہے اس نے "کفر و ایمان" تک کی شدت اختیار کر رکھی ہے۔ مشکل بالائے مشکل یہ کہ خود سُنّیوں کی کتبِ روایات و تاریخ میں بھی ایسی ایسی باتیں ملتی ہیں، جو ان حضرات (صحابہ کرامؓ) کے شایانِ شان نہیں۔ اس قسم کی روایات اور تاریخی شواہد پر تنقید کا نتیجہ وہی ہو سکتا تھا، جس کا ذکر حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح کے سلسلہ میں آچکا ہے۔ پھر جب اس سوال کا دوسرا حصہ سامنے آتا (یعنی یہ کہ یہ نظام آگے کیوں نہ چلا اور اس کے بعد اسلام پر کیا بیتی) تو اس سلسلہ میں میری تحقیق نے مجھے جن نتائج تک پہنچایا، ان سے مروّجہ اسلام کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں رہتا جو نظرِ ثانی کا محتاج و متقاضی نہ ہو۔ اس سے یہ کیفیت ایک حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے کہ

تمدّن، تصوّف، شریعت، کلام — بُتانِ عجم کے پُجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ اُمّت روایات میں کھو گئی (اقبالؒ)

مذہبی پیشوائیت میں حقائق کے سامنا کرنے کا نہ حوصلہ ہوتا ہے نہ برداشت، اور جب حقائق کی گیرائی اور گہرائی کا یہ عالم ہو تو اس کے ردِّ عمل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ میں ایک عرصہ تک، ان مشکلات پر غور کرتا رہا۔ ایک طرف قرآنِ کریم کا تقاضا تھا کہ ـــــ دیکھا ہے جو کچھ تو نے، اوروں کو بھی دکھلا دے ـــــ دوسری طرف یہ موانعات تھے۔

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں

میں ایک عرصہ تک اسی بیم و رجا میں رہا لیکن بالآخر اب (جبکہ میری عمر ستر برس سے بھی متجاوز ہو گئی ہے اور نہیں معلوم کہ خدا کے طبیعی قانون کی رُو سے مجھے اس دنیا میں رہنے کی کس قدر مزید مہلت مل سکتی ہے) میں نے مناسب (ہی نہیں ضروری) سمجھا کہ میں ان حقائق کو اربابِ فکر و نظر کے سامنے لے آؤں۔ "ضروری" اس لئے کہ اسلام بہ حیثیتِ دین (نظامِ حیات) سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک یہ نہ دیکھا جائے کہ اس کی عملی شکل کیا ہے۔ میں نے اس کتاب میں دین کے مختلف گوشوں کو پہلے قرآنِ کریم کی روشنی میں، نظری حیثیت سے پیش کیا ہے اور پھر اس امر کی وضاحت کی ہے کہ صدرِ اوّل میں اس پر عمل کس طرح ہوا تھا۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، دین کا یہ نظام، عہدِ رسالتمآبؐ اور شیخین (حضرت صدیقِ اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ) کے زمانہ میں، اس جماعت کے ہاتھوں متشکل ہوا تھا جس کی تعلیم و تربیت خود رسالتمآبؐ کے مقدس ہاتھوں عمل میں آئی تھی اور جنھیں صحابہؓ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان حضرات کی اس خصوصیتِ کبریٰ کی بنا پر، قرآنِ کریم نے اس کا تعارف بڑی شرح و بسط سے کرایا ہے۔ انھیں اس نے اَلَّذِیْنَ مَعَہٗ (۴۸/۲۹) "رسول اللہ کے ساتھی" کی جمع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے، اور خود حضورؐ کو ان کا صاحب" (ساتھی) کہہ کر پکارا ہے (۵۳/۲) ایک مقام پر حضورؐ کے شریکِ غار کو صاحبہ کہا ہے۔ (۹/۴۰) حضورؐ کے ان ساتھیوں کو عام طور پر "مومنین" کہا گیا ہے لیکن مزید تعارف کی غرض سے انھیں مہاجرین اور انصار کے گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اس دور میں اسلام لانے والوں کے ایک اور گروہ کا ذکر بھی قرآن میں آیا ہے جو اعراب (بادیہ نشینوں) پر مشتمل تھا۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی حیثیت سے مملکتِ اسلامی کی اطاعت تو قبول کر لی تھی لیکن "ایمان ان کے دلوں کی گہرائیوں میں نہیں اُترا تھا۔" (۴۹/۱۴) قرآنِ کریم نے جن "نابختہ ایمان والوں" کا ذکر کیا ہے۔ ان سے یہ لوگ مراد ہیں۔ ان کے سوا، باقی تمام وہ مومن تھے جن کے راستے پر چلنے کی تاکید خود قرآن نے کی ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ اس راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کریں گے ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ (۴/۱۱۵) اس سے ان حضرات (صحابہ کرامؓ) کے مقام کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

(۲) ان کی اہمیت کے متعلق کہا ہے کہ هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ (۸/۶۲) خدا وہ ہے جس نے، اے رسول! اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین کو تمھاری تائید و تقویت کا موجب بنایا۔ آگے چل کر اس کی وضاحت

ان الفاظ سے کردی:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۸/۶۴)

اے نبی! (i) خدا اور (ii) یہ جماعت مومنین، جو تیرا اتباع کرتی ہے تیرے لئے کافی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ صحابہؓ کی جماعت کا مقام اس قدر بلند تھا کہ خدا نے انھیں اپنے ساتھ ہم قوس قرار دے کر، یہ کہہ کہ یہ دونوں (خدا اور جماعتِ مومنین) حضورؐ کے مشن کی کامیابی کے لئے کافی ہیں۔

(۳) صحابہؓ کی اس اہمیت کے پیش نظر حضورؐ سے کہا گیا کہ "یہ لوگ جو منشائے خداوندی کو پورا کرنے کے لئے صبح وشام، مسلسل وپیہم — خدا کو پکارتے ہیں، انھیں اپنے قریب رکھو، دھتکارو نہیں۔ (۶/۵۲ ؛ ۱۸/۲۸) وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۱۵/۸۸ ؛ ۲۶/۲۱۵) - ان کی اس طرح پرورش اور حفاظت کرو جس طرح مرغی اپنے بچوں کی پرورش اور نگہداشت کرتی ہے۔

(۴) جیسا کہ بتایا جاچکا ہے، یہ جماعت، مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھی۔ ان کے متعلق فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ (۸/۷۴)

وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے انہیں پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ یہ سب کے سب سچے اور پکے مومن (مومن حقا) ہیں۔ ان کے لئے مغفرت ہے اور عزت کا رزق۔

اس آیۂ جلیلہ میں، اللہ تعالیٰ نے، جملہ مہاجرین اور انصار کو مومنِ حقا کہہ کر پکارا ہے اور ان کی مغفرت اور رزقِ کریم کی ضمانت دی ہے۔ اس آسمان کے نیچے، کسی کے ایمان اور مغفرت کی اس سے بڑی شہادت اور کون سی ہوسکتی ہے؟

(۵) ان میں کچھ وہ تھے جنھوں نے حضورؐ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہا اور کچھ وہ جو اُن میں ذرا بعد شامل ہوئے۔ خدا نے ان سب کے لئے جنت کی بشارت دی ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (۹/۱۰۰)

مہاجرین اور انصار میں سے جنھوں نے سبقت کی اور وہ جو حسن کارانہ انداز سے ان میں بعد میں شامل

ہوئے۔ اللہ ان سب سے راضی ہو گیا اور وہ اپنے رب سے راضی ہو گئے۔ خدا نے ان کے لئے ایسے باغات (جنّت) تیار کر رکھے ہیں۔ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

غور فرمایئے۔ خدا نے تمام صحابہؓ کے لئے، خواہ وہ السابقون الاوّلون کے زمرے میں شریک تھے اور خواہ وہ ان میں بعد میں شامل ہوئے ابدی جنّت کی ضمانت دی ہے اور سب کے لئے "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" کا درخشندہ سرٹیفکیٹ عطا فرمایا ہے۔ دوسرے مقام پر، ان میں بعد میں شامل ہونے والوں کے متعلق کہا ہے — اُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ۔ (۸/۷۵) وہ بھی تم میں سے ہیں۔ جہاں تک خدا کے وعدے کا تعلق ہے، ان میں اور تم میں کوئی فرق نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآنی معیار کی رُو سے، مدارج کا تعیّن اعمال کی رُو سے ہوتا ہے۔ (۴۶/۱۹) لہذا السابقون الاوّلون کے مدارج زیادہ بلند ہوں گے، لیکن جہاں تک جنّت و مغفرت کے خدائی وعدہ کا تعلق ہے، وہ ان سب کیلئے یکساں ہے۔ چنانچہ سورۃ حدید میں فرمایا:

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (۵۷/۱۰)

وہ لوگ جنھوں نے فتح مکہ سے پہلے خدا کی راہ میں مال خرچ کیا اور جنگوں میں شریک ہوتے اور وہ جنھوں نے اس کے بعد ایسا کیا، مدارج کے اعتبار سے یہ دونوں گروہ ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ السابقون الاوّلون کے مدارج بے شک بلند ہیں لیکن خدا کے حسین اور خوشگوار وعدے (یعنی جنّت اور مغفرت کے وعدے) ان سب کے لئے ہیں۔ خدا تم سب کے اعمال سے باخبر ہے (اس لئے اس نے یہ ضمانت یونہی نہیں دے دی۔)

(۶) یہ تھی وہ جماعتِ صحابہؓ، رسول اللہ کے ساتھی، جن کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے، سورۃ الفتح میں ان وجد آور الفاظ میں کیا ہے۔ آپ قرآنِ کریم کے ان حسین و جمیل الفاظ پر غور کیجئے اور پھر ان رفقائے محمدؐ کے مقامات و مدارج کا تصوّر کیجئے۔ فرمایا۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

تَرٰىهُمْ رُكَّ [illegible] جَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ
فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّ [illegible] السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ
فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَ [illegible] عٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى
سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۔ (۴۸/۲۹)

میں اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم، اپنے مفہوم القرآن سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

محمدؐ اللہ کا رسول اور اس کے رفقاءِ کار کی جماعت۔ یہ جماعت بھی کیا عجیب و غریب جماعت ہے! ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں، لیکن باہم گر بڑے ہی نرم دِل اور ھمدرد (۵/۵۴) تو انھیں دیکھتا کہ وہ کس طرح ذمّہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے جُھک جاتے ہیں، اور قوانینِ خداوندی کے سامنے پیکرِ تسلیم و رضا بن جاتے ہیں (لیکن یہ تارک الدنیا راہبوں کی جماعت نہیں) یہ، قانونِ خداوندی کے مطابق، سامانِ زیست کی تلاش میں مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا ہر عمل قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ اور ان کی سیرت، صفاتِ خداوندی سے یکرنگ ہو جاتے ۔ اس سے انھیں جو سکونِ قلب اور حقیقی مسرّت حاصل ہوتی ہے، اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ علامات سابقہ کتبِ آسمانی ــــ تورات و انجیل ــــ میں بھی مذکور تھیں۔

انھوں نے نظامِ خداوندی کو جس طرح قائم کیا اور پروان چڑھایا ہے، اس کی مثال یوں سمجھو کہ جب عمدہ بیج سے شگوفہ پھوٹتا ہے تو اس کی پہلی کونپل بڑی نرم و نازک ہوتی ہے۔ پھر جوں جوں اس کی جڑ مضبوط ہوتی جاتی ہے، اس کی نال موٹی ہوتی جاتی ہے۔ حتّٰی کہ وہ اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے سہارے آپ محکم اور استوار طریق پر قائم ہو جاتی ہے۔ (اس میں خوشے لگتے ہیں اور خوشوں میں دانے پڑ کر سخت اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ ننھا سا بیج پکی ہوئی فصل میں تبدیل ہو جاتا ہے) جب کاشت کار اپنی محنت کو اس طرح ثمر بار ہوتے دیکھتا ہے تو وجد و مسرّت سے جھوم اٹھتا ہے لیکن یہی چیز اس کے مخالفین کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے لگ جاتی ہے۔

اسی طرح اللہ، ہر اس جماعت کو جو اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان لا کر، اس کے بتائے ہوئے

پروگرام پر عمل پیرا ہوتی ہے، اس امر کا وعدہ دیتا ہے (یعنی یہ اس کا قانون ہے) کہ ان کی کوششوں کا ننھا سا بیج، تمام خطرات سے محفوظ رہے گا اور ان کی کھیتی پک کر بہترین ثمرات کی حامل ہو جائے گی۔ (۲۴/۵۵)۔ (لیکن اس کے لئے اس قسم کی محنت اور استقامت کی ضرورت ہو گی جس قسم کی محنت اور استقامت کا ثبوت کسان دیتا ہے۔ (تخمِ صالح، قوانینِ فطرت سے مطابقت مسلسل محنت اور استقلال و استقامت۔ کھیتی کی برومندی کے لئے یہ تمام شرائط لاینفک ہیں)۔

یہ تھے صحابہ رسول اللہ، جنھیں خدا نے مومن حقاً (پکے اور سچے مومن) کہہ کر پکارا۔ جنھیں جنّت اور مغفرت کی بشارت ہی نہیں دی بلکہ وعدہ کر کے اس کی ضمانت دے دی (کہ خدا کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا (۳/۸) ان کے متعلق وضاحت کر دی کہ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ یہ شہادت، ضمانت، صراحت، وعدے ان سب کے لئے تھے۔ ان میں کسی کی استثناء نہیں تھی۔ یہ تمام مہاجرین و مجاہدین و انصار کے لئے یکساں تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) صحرائی قبائل (اعراب) ایسے تھے جن کی تعلیم و تربیت نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے "ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا تھا۔" قرآنِ کریم میں جن منافقین کا ذکر آتا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ انھی میں سے ہوں۔ لیکن مومنین اور منافقین میں تمیز حضورؐ کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے۔ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ط (۳/۱۷۸)۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا اس معاشرہ کو علیٰ حالہ رہنے دے۔ وہ خبیث و طیب میں تمیز کر کے رہے گا۔ اس سے واضح ہے کہ یہ تمیز حضورؐ کی زندگی میں ہو چکی تھی۔ بہرحال، اتنی بات تو حتمی اور یقینی ہے کہ مہاجرین و انصار، جن سے خدا نے جنّت کا وعدہ کیا تھا، آخری دم تک مومن حقاً رہے تھے کیونکہ جنّت کا وعدہ تو خدا انہی سے کر سکتا تھا جو زندگی بھر (اپنے مرنے تک) جنّت کے مستحق رہے ہوں۔ جو شخص آج مومن ہو اور کل کو (معاذ اللہ) مرتد ہو جائے اسے خدا جنّت کی ضمانت کس طرح دے سکتا ہے؟

لیکن ہماری کتبِ روایات و تاریخ میں انہی صحابہؓ کے متعلق وہ کچھ لکھا ملتا ہے جس سے ان کا مومن حقاً اور مستحق جنّت ہونا تو ایک طرف، مسلمان ہونا بھی باقی نہیں رہتا۔ شیعہ حضرات کا (اپنی روایات کی رو سے) عقیدہ ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد، اہلِ بیت کے علاوہ، صرف پانچ مسلمان رہ گئے تھے۔ باقی سب (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے۔ آپ کو غالباً خیال گزرے گا کہ شیعہ حضرات کا مسلک الگ ہے اس لئے ان کے ہاں اس قسم کی روایات کا پایا جانا مستبعد نہیں، لیکن سنّی تو تمام صحابہؓ کے مومن حقاً ہونے پر ایمان رکھتے ہیں لیکن یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہو گی کہ سنّیوں کے

بھی اس قسم کی روایات موجود ہیں۔ جن کی رُو سے صحابہؓ کا (معاذ اللہ) مرتد ہو جانا ثابت ہے۔ سُنّیوں کے ہاں بخاری احادیث کی معتبر ترین کتاب سمجھا جاتا ہے۔ اس میں حسب ذیل حدیث موجود ہے۔

> رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے صحابہؓ کی ایک جماعت کو (فرشتے) جہنم کی طرف لئے جا رہے ہوں گے۔ میں پکاروں گا کہ یہ تو میرے صحابی ہیں، یہ میرے صحابی ہیں۔ اللہ فرماتے گا کہ (اے رسولؐ) جب تو ان سے جُدا ہوا تو یہ مرتد ہو کر اپنے سابقہ مذہب کی طرف لوٹ گئے تھے۔
>
> (بُخاری۔ کتاب الانبیاء)

یہ ہے میرا موقف، تاریخ کے سلسلہ میں۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے، اسلام پر جس قدر اعتراضات وارد ہوتے ہیں، اور اس کی جس قدر گھناؤنی تصویر سامنے لائی جاتی ہے، اس کی ذمہ داری ہماری کتبِ روایات و تاریخ پر عائد ہوتی ہے بنا بریں، اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ قرآنِ کریم کو معیار قرار دے کر عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ صحابہؓ کی تاریخ از سرِ نو مرتب کی جاتے۔ یہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ میرا بہرحال، یہی مسلک اور مشن ہے۔ (جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے) میں نے، اسی معیار کے مطابق، پہلے حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کو مرتب کیا۔ اس کے بعد میں نے عہدِ صحابہؓ کی تاریخ کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا تو دیکھا کہ وہ بھی رطب و یابس سے پٹی پڑی ہے۔ میں نے اسے بھی، قرآنی معیار کے مطابق پرکھا اور کھنگالا۔ اس سلسلہ میں، میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا ہے، اسے مغربی مؤرخین کے معیار کی رُو سے ہسٹوریکل ریسرچ (تاریخی تحقیق) قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں، تاریخی تحقیق کی گنجائش ہی نہیں اور جو اس کا دعویٰ کرتا ہے وہ یا تو غلط فہمی میں مبتلا ہے یا غلط بیانی سے کام لیتا ہے۔ ہمارا سارا تاریخی سرمایہ متقدمین کی چند کتابیں ہیں، جو صدرِ اوّل کے صدیوں بعد، بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے، محض بربنائے روایات، مرتب ہوئی تھیں۔ ہمارے ہاں کے "محققین" اس سے زیادہ کچھ کر ہی نہیں سکتے کہ وہ ان کتابوں میں سے، اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق، واقعات منتخب اور مقتبس کر کے، ایک نئی تالیف مرتب کر دیں۔ میں نے بھی یہی کیا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ میرا معیارِ انتخاب و اقتباس، میرا ذاتی نقطۂ نگاہ نہیں بلکہ غلط اور صحیح کا قرآنی معیار ہے۔ میری پیشکش اسی اعتبار سے منفرد ہے، اور (میرے نزدیک) اس لئے اہم کہ یہ میرے مدت العمر کے مطالعہ اور فکر کا ماحصل اور میری زندگی کا نقطہ ہ کارِ تمنا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

پرویز

حسین امیر فرہاد

تم سبھی کچھ ہو......

چندسال پہلے کی بات ہے. کویت میں محترم محمد عمر دراز صاحب کے ہاں ایک تصویر دیکھی تھی. متناسب جسم متوسط قد و قامت، خوبصورت آنکھیں، عمر تقریباً بائیس چوبیس کے درمیان، سر پہ چوہدریوں والی پگڑی، اونچا شملہ، تن پر شیروانی، محترم پرویز صاحب سے حیرت انگیز مشابہت. میں نے پوچھا یہ خوبصورت جوان کون ہیں؟ کہا. یہ پرویز صاحب کی تصویر ہے جب وہ چوہدری غلام احمد پرویز ہوا کرتے تھے. جب خرد کی آنکھیں وا ہوئیں، تو صرف غلام احمد پرویز لکھنے لگے.

یہی وجہ تھی کہ محترم پرویز صاحب کے عقیدتمندوں نے بھی ذات پات اور برادری کی زنجیریں توڑنی شروع کردیں.

سب سے پہلے محمد عمر دراز صاحب نے اپنے نام کے ساتھ حاجی اور خان لکھنا چھوڑ دیا. کچھ اور اشخاص بھی ہوں گے. راقم، جو حاجی حسین امیر بیگ کہلاتے تھے (تخلص فرہاد). اب صرف حسین امیر فرہاد پر اکتفا کیا.

گذشتہ دنوں ڈنمارک سے چوہدری محمد الیاس صاحب تشریف لائے. انہوں نے چیئرمین ادارہ طلوع اسلام سے درخواست کی کہ آئندہ مجھے محمد الیاس کے نام سے مخاطب کیا جائے. چوہدری کو حذف کیا جائے.

جب ہمارے اجداد اسلام لے آئے تو کیا ضرورت ہے کہ ہم ہندوؤں کی ذات پات کی گٹھڑیاں کاندھوں پر لئے گھومیں.

قارئین کرام! بلاشبہ عرب میں قبائلی تفاخر بہت زیادہ تھا. وہ لوگ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے تھے. کہتے تھے. انا بنی قحطان، انا بنی عدنان، انا بنی عفان، انا بنی مرۃ — اور ایام جاہلیت کے ابطال (HEROS) کو یاد کرتے تھے. مثلاً عنتر بن شداد کے بہادری اور شجاعت کے گیت گاتے تھے — فارس الاسود پر فخر کرتے تھے. یوں سمجھ لیجئے کہ یہ عربوں کے رانا پرتاب سنگھ پرتھوی راج چوہان اور جنرل چوہدری تھے

مگر بعثتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قبیلے پر فخر ترک کر دیا گیا۔ عزت و تکریم کا معیار تقوےٰ قرار پایا۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)۔ قبیلہ صرف پہچان کے کام آنے لگا۔ وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا (۴۹/۱۳)۔ یہ اس لئے کہ عرب میں ہر شخص اپنے بڑے بیٹے کا نام اپنے باپ کے نام پر رکھتا ہے یا جد کے نام پر جیسے یزید بن معاویہ بن یزید بن معاویہ بن یزید۔ سالم بن احمد بن سالم بن احمد۔ اس سے کوئی بھی آدمی اپنا شجرۂ نسب نہیں بھولتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یکساں ناموں کی کثرت ہے۔ مثلاً عبداللہ، سالم، محمد، احمد، علی اور خلیفہ وغیرہ۔ جب مماثلت کی وجہ سے پہچان مشکل ہو جاتی ہے تو قبیلے کا نام ساتھ لگا دیا جاتا ہے مگر فخریہ طور پر نہیں، صرف پہچان کے لئے۔ جب ہی تو سلمان فارسیؓ نے فرمایا تھا

ابی الاسلام لا اَبَ لی سواہ

اذا افتخروا بقیسٍ او تمیم

اگر لوگ فخر کرتے ہیں قیس او تمیم پر، تو میرے آبا تو اسلام ہیں۔ مجھے اس پر فخر ہے۔

ہمارے ہاں اس ذات برادری، فرقہ بندی، پارٹی بازی، گروہ بندی کی وجہ سے بڑی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔

جب اس امت کو نبی اکرمؐ نے چھوڑا تو یہ امت، امتِ واحدہ تھی۔ اس کے بعد تاریخ کے اوراق چودہ سو سال آگے کی طرف اُلٹیئے اور دیکھئے کہ آج اسی امتِ واحدہ کی کیا صورت ہے؟ تعداد کے اعتبار سے دیکھئے، تو آسمان کے تاروں کی طرح ان گنت۔ جغرافیائی پوزیشن کے اعتبار سے دیکھئے تو کرۂ ارض کے بیچوں بیچ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر لیکن اختلافات کو دیکھئے، تو انسان محوِ حیرت رہ جائے کہ کیا یہ وہی امت ہے جس کی وحدت کے متعلق قرآن کریم نے اتنے تاکیدی احکام دئے تھے۔ کہیں نسلوں کا اختلاف ہے یہ مغل وہ پٹھان، یہ ترک وہ عرب۔ کہیں قومیتوں کا اختلاف ہے۔ یہ مصری وہ ایرانی، وہ عراقی یہ حجازی، یہ ہندی وہ چینی ـــ یہ تو رہے نسبی اور وطنی اختلافات۔ اس سے آگے بڑھئے تو ایک ہی ملک کے اندر ذاتوں اور برادریوں کے اختلافات۔ شیخ، مرزا، راجپوت، پٹھان، جاٹ، ارائیں۔ پھر صوبائی اختلافات۔ سندھی پنجابی، سرحدی، بلوچی، بنگالی۔ ان سب اختلافات سے اوپر اور سب سے گہرا مذہبی فرقہ بندی کا اختلاف۔ یہ شیعہ وہ سنّی، یہ حنفی وہ وہابی، یہ دیوبندی وہ بریلوی، یہ اہل حدیث، وہ اہلِ قرآن۔ ان کے علاوہ سیاسی پارٹیوں کے ہنگامی اختلافات۔ جب انسان اس امت کو دیکھتا ہے جسے نبی اکرمؐ نے چھوڑا تھا اور اس کے بعد اس امت پر نظر ڈالتا ہے جو آجکل ہمارے سامنے ہے تو وہ انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ یقیناً آسمان کی آنکھ نے ایسا انقلاب کبھی نہیں دیکھا ہو گا! یہ اختلافات کیسے رونما ہوئے اور امتِ واحدہ اس قدر تاکیدات کے باوجود اتنے ٹکڑوں میں کیسے بٹ گئی۔ یہ ایک جگر پاش داستان ہے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

یہ ہے اس امت کا حال جس سے نبی اکرمؐ نے کہہ دیا تھا کہ تم یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ وحدت اور اتحاد صرف نبی اکرمؐ کی زندگی تک ہے۔ حضورؐ کے بعد اس میں اختلاف اور تفرقہ پیدا ہو سکتا ہے اور یہ امت فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ سکتی ہے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ محمد بجز ایں نیست کہ اللہ کے رسول ہیں۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گزرے ہیں اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۚ سو اگر یہ (کل کو) وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم (یہ سمجھ کر کے کہ یہ سارا نظام اور امت کی وحدت آپؐ کی زندگی تک تھی) پھر سے اسی روشِ کہن کی طرف پلٹ جاؤ گے (اور فرقوں گروہوں میں بٹ جاؤ گے؟) وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـــًٔا ۭ (۳/۱۴۴) اور جو کوئی اس روشِ کہن کی طرف پلٹ جائے گا تو وہ اس سے اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا (اپنا ہی نقصان کرے گا)۔ اب دیکھنا یہ چاہیئے کہ کیا امت میں پھر سے وہی وحدت پیدا ہو سکتی ہے اور اگر ہو سکتی ہے تو کس طرح؟ آسان علاج ہے۔ وہ یہ کہ ہم متمسک بالقرآن ہو جائیں۔ قرآن کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

"اور ہم نے تیرے اوپر یہ کتاب نازل ہی اس لئے کی ہے کہ تو لوگوں پر ان باتوں کو واضح کر دے جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔" (۱۶/۶۴)

یعنی قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے اندر نوعِ انسانی کے اختلافات مٹانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے نزول کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اختلافی امور کو واضح کر کے دودھ اور پانی کو الگ الگ کر دے۔ قرآن کی موجودگی میں اختلاف کیسا۔

اب ظاہر ہے کہ اس کی موجودگی میں اگر ہم کہیں کہ اختلافات مٹنے کی کوئی صورت نہیں، تو اس سے یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) قرآن کا یہ دعوےٰ غلط ہے کہ وہ اختلافات مٹا سکتا ہے اور یا یہ کہ قرآن کے اس دعوے پر ہمارا ایمان نہیں۔ ہر فرقے کا یہ دعوےٰ ہے کہ اس کا مسلک قرآنِ کریم کے مطابق ہے تو پھر اختلافات کیوں ہیں کیونکہ قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ ـــــ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہی یہ ہے کہ مجھ میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں یہ بہت سے اختلافات پاتے۔

ان تصریحات سے واضح ہوا کہ قرآنِ کریم میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس لئے اس سے مختلف فرقوں کو اپنے اپنے

مسلک کی تائید میں سند نہیں مل سکتی۔ قرآنِ کریم اختلافات مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اس میں آج بھی ہمارے اختلافات مٹانے کی صلاحیت موجود ہے۔ بشرطیکہ یہ ہے کہ ہم متمسک بالقرآن ہو جائیں۔ یعنی وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۲) تم سب کے سب بلا استثناء اجتماعی طور پر اس نظام کے ساتھ محکم طور پر وابستہ رہو اور امت میں فرقہ پرستی اور پارٹی بازی کو مت آنے دو کیونکہ فرقہ پرستی شرک ہے (۳۰/۳۱-۳۲)۔ اللہ تعالیٰ نے ہر پیغمبر کو تاکید کی ہے کہ تفرقہ پیدا نہ ہو۔ فرمایا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ ...... (۴۲/۱۳)

(اے رسولؐ!) اللہ نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور وہی وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے جس کا ہم نے ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم کیا تھا۔ (وہ حکم یہ تھا کہ) خدا کے مقرر کردہ نظامِ زندگی (الدین) کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ مت ڈالو۔ (یہی دعوت تمہاری ہے) لیکن جس بات کی طرف تو انہیں بلاتا ہے مشرکین پر وہ بات بڑی گراں گزرتی ہے۔

یہاں اس بات کو ذرا غور سے سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اختلافات مٹا کر ان میں وحدت پیدا کرنے کی دعوت مشرکین پر بڑی گراں گزرے گی۔ اب ظاہر ہے جن لوگوں پر آج یہ دعوت گراں گزرتی ہے وہ مشرکین سے کم تو نہیں جو آج بھی ذات برادریوں، قومیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۴/۱) اللہ نے ایک جرثومہ حیات سے سب کو پیدا کیا۔ ہم ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ درخت کی ایک شاخ دوسری شاخ کی تباہی کی فکر میں نہیں لگی رہتی نہ ایک پتہ دوسرے کی گھات میں بیٹھا ہوتا ہے۔ درخت شاداب اور سرسبز ہوتا ہے تو اس کی ہر شاخ سرسبز رہتی ہے۔ اگر وہ خشک ہوتا ہے تو اس کی ہر ٹہنی مرجھا جاتی ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹)

اور تمام امت ایک برادری تھی۔ پھر انہوں نے باہمی اختلافات شروع کر دئیے۔

فرمایا،

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ

شَیْءٍ ؕ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَی اللّٰهِ ثُمَّ ..... (۶/۱۶۰)

جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور الگ الگ گروہ بن جائیں، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ قانونِ خداوندی کے سپرد کر دو وہی بتائے گا کہ ان کی اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا۔ (مفہوم)

دوسرے مقام پر ارشادِ خداوندی ہے۔ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (۳/۱۰۴) یاد رکھو! تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح قوانینِ خداوندی آجانے کے بعد فرقوں میں بٹ گئے اور باہم دیگر اختلافات کرنے لگ گئے۔ یہ بڑا سنگین جرم ہے اس لئے اس کی سزا بھی بڑی سخت ہے اس سے قومیں ذلیل و خوار اور تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ (مفہوم)

ان واضح احکامات کے بعد بھی اگر کوئی اپنے آپ کو مومن اور مسلم سمجھتا ہے تو عبرت کا مقام ہے۔

پیغامِ اقبالؒ

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی — تُو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تُو اے مُرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

حقائق و عبر

جُرم کا خاتمہ جُرم سے

قارئین کرام! اسلامیہ جمہوریہ پاکستان میں ایک ایسا شرمناک واقعہ وقوع پذیر ہوا ہے کہ شرم کے مارے انسانیت کی آنکھیں جُھک جاتی ہیں۔ ۱۷ مئی کے روزنامہ نوائے وقت کے اداریئے کے مطابق ہوا یوں کہ مٹھن کوٹ میں گاؤں کے معززافراد پر مشتمل پنچایت نے ایک شخص کو اختیار دیا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ مبینہ زیادتی کا ارتکاب کرنے والے شخص کی بیوی کو زیادتی کا نشانہ بنائے۔ ملزم نے درجنوں افراد (جن میں پولیس والے بھی تھے) کی موجودگی میں خاتون کو زیادتی کا نشانہ بنایا۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ کسی شخص کو خلافِ قانون اور خلافِ انسانیت کام کا اختیار دیا گیا ہو۔

اور پنچایت کی موجودگی میں اس قبیح فعل کا ارتکاب بھی کرایا گیا ہو۔

فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝ (۵۹/۲)

طلوعِ اسلام

اے صاحبانِ عقل و بصیرت! تمہارے لئے اس واقعہ میں ہزارہا سامانِ عبرت ہے۔ (مفہوم القرآن)

عربی مقولہ ہے کہ پانی کمزور پہلو سے بہہ نکلتا ہے۔ ثابت ہوا کہ ہمارے معاشرے میں عورت سے زیادہ کمزور اور ناتواں اور کوئی نہیں۔ ورنہ مرد کے ظلم اور زیادتی کی سزا عورت کو کیوں دی جاتی۔ سزا تو اسے ہی دینی چاہیے جس نے جرم کا ارتکاب کیا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝ (۵۳/۳۸)

کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (مفہوم القرآن)

اور اس کی غیرت کو کیا ہوا جس کی موجودگی میں اس کی بیوی کی عزت لٹ گئی اور وہ دیکھتا رہا۔ کیا وہ اس کے ساتھ زندگی گذار سکے گا؟ کیا وہ عورت محلے والوں کے طعنے برداشت کر سکے گی؟ ایسی عورتیں اکثر خودکشی کر لیتی ہیں۔

اللہ کی نیابت

ورلڈ اسلامک فورم کا ترجمان ماہنامہ الشریعہ (گوجرانوالہ) جون ۱۹۹۴ء کے شمارہ میں رئیس التحریر ابوعمار زاہد الراشدی خلافتِ اسلامیہ کے احیاء کی اہمیت اور اس کے تقاضے کے عنوان کے تحت رقمطراز ہے۔

"سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ خلافت کا مفہوم کیا ہے اور جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد کیا ہوتی ہے؟ خلافت کا لفظی معنی ہے نیابت یعنی کسی کا نائب ہونا۔ قرآنِ کریم نے خلافت کا لفظ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے حوالے سے نسلِ انسانی کے لئے اختیار کیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں (البقرہ)۔ یہاں خلیفہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی نسل ہے۔ یعنی اس کائناتِ ارضی کا نظام اللہ رب العزت نے نسلِ انسانی کے سپرد فرمایا ہے اور وہ اس نظام کو چلانے میں اللہ تعالیٰ کی نائب ہے۔"

ادارہ طلوعِ اسلام

عرض یہ ہے کہ خلیفہ کا مادہ (خ۔ل۔ف) ہے اس کے معنی ہیں پیچھے، بعد میں۔ اس اعتبار سے کسی کے جانشین کو خلیفہ کہتے ہیں۔ یعنی وہ جو پہلے جانے والے کی جگہ پر آئے۔

چونکہ جانشینی میں غلبہ و تسلط اور اختیار و اقتدار کا مفہوم آجاتا ہے اس لئے استخلاف فی الارض کے معنی ہوئے، ملک میں صاحبِ اختیار ہونا۔ حکومت کے لئے خلافت کا لفظ بھی انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲/۳۰)۔ اس آیت سے عام طور پر یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ اللہ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ یا نائب بنایا۔ یہ مفہوم کئی وجوہ کی بنا پر غلط ہے۔ ایک تو اس لئے کہ قرآنِ کریم میں کہیں بھی آدم کو خلیفۃ اللہ نہیں کہا گیا۔ دوسرے اس لئے کہ خلیفہ یا نائب ہمیشہ اس وقت کام آتا ہے جب اصل شخصیت موجود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ ہمیشہ اور ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ (۴۳/۸۴) وہی سما میں الٰہ ہے وہی ارض میں۔ وہ قریب ہے (۲/۱۸۶)۔ وہ سمیعٌ قریب (۳۴/۵۰) سننے والا اور نزدیک ہے۔ رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب (۵۰/۱۶)۔ نہ اس کے لئے موت ہے نہ بیماری، نہ ٹرانسفر نہ اونگ (نہ نیند) (۲/۲۵۵)۔ اس لئے خدا کے بعد یا عدم موجودگی میں اس کی نیابت یا جانشینی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آدم (انسان) کو جو خلیفہ فی الارض

کہا گیا ہے تو اس اعتبار سے کہ انسان اس مخلوق کا جانشین ہے جو اس سے پہلے زمین پر آباد تھی۔ دیکھئے آیت (۲۷، سورہ حجر)۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا نائب ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ انسان ہونے کے ناتے فرعون، نمرود، میاں چنگیز خان اور ہلاکو خان، یزید، ہٹلر، گاندھی، نہرو، لینن، کارل مارکس اور لعنت اللہ علی سلیمان رشدی یہ سب اللہ تعالیٰ کے خلفاء و نواب ہیں۔ اور پھر نائب یا خلیفہ کا ہم جنس ہونا لازمی ہے۔ مثلاً صدر پاکستان ملک سے باہر جاتے وقت سینٹ کے چیئرمین کو اپنی جگہ بٹھا کر جاتے ہیں جو ان کی طرح انسان ہیں۔ کوئی صاحب اپنی عدم موجودگی میں اپنے گھوڑے یا کتے کو اپنا جانشین نہیں بنا سکتے۔ شیر کا نائب شیر ہوگا اور بجرے کا بجرا۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ اگر اپنا نائب یا خلیفہ بناتے تو وہ ان جیسا اللہ ہی ہوتا، انسان نہ ہوتا۔ مگر دوسرے خدا کا تصور بھی کفر ہے۔ اور ضرورت کیا آن پڑی۔ کیا (معاذ اللہ) اللہ تھک گئے یا انہیں چھٹی کی ضرورت پڑ گئی۔ پشتو کے عظیم شاعر رحمان بابا فرماتے ہیں کہ

شریک نہیں رکھتا وہ اپنی بادشاہت میں
لاشریک ہے شہریار رب میرا

فرمانِ خداوندی ہے۔ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا (۱۸/۲۶)۔ القیوم، وہ جس سے ہر شے اپنے وجود کو لئے ہوئے قائم ہو لیکن اسے اپنی ذات کے لئے کسی سہارے کی ضرورت نہ ہو۔ (مفہوم ۲/۲۵۵)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"ان اقوامِ سابقہ کے بعد ہم نے تمہیں ان کا جانشین (خلیفہ) بنایا تاکہ یہ دیکھا جائے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو....." (۱۰/۱۴)

وہ آیات جن میں خلیفہ کا ذکر ہوا ہے

(۱) حضرت داؤدؑ کو خلیفہ فی الارض بنایا.... (۳۸/۲۶)۔

(۲) اور موسیٰؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا۔ خْلُفْنِیْ، تم میرے جانشین ہو (۷/۱۴۲)۔ اس آیت سے آشکارہ ہے کہ خلیفہ کے معنی ہیں کسی کی غیر موجودگی میں جانشینی کے فرائض انجام دینا۔

(۳) حضرت نوحؑ کے ساتھیوں کو ان کا جانشین بنایا جو غرق ہوئے (۱۰/۷۳)۔

(۴) انبیاءؑ کے بعد ان کے تابعین ناخلف پیدا ہو گئے (۱۹/۵۹)۔

(۵) جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً۔ اور جس خدا نے خارجی کائنات میں ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ رات اور دن ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔ (۲۵-۶۲)

(۶) اگر خدا چاہتا تو زمین پر ملائکہ کو خلیفہ بنا دیتا (۶۰/۴۳)۔
(۷) تم اس مال کو خرچ کرو جس کا تمہیں وارث اور خلیفہ بنایا (۷/۵۷)۔
(۸) قومِ موسٰیؑ کے جانشینوں کو کتاب کا وارث بنایا (۱۶۹/۷)۔
(۹) تو آج ہم تیرے بدن کو دریا سے نکال لیں گے تاکہ تو خَلْفَكَ (پچھلوں کے لئے عبرت بنے)۔
(۱۰) خالفین، پیچھے رہ جانے والے (۸۷/۹)۔
(۱۱) اگر ہمارا پروردگار چاہے تو تمہیں نابود کر دے۔ تمہاری جگہ کسی اور قوم یا نوع کو تمہارا خلیفہ بنا دے جس طرح تمہیں پہلی اقوام کا خلیفہ بنایا۔
(۱۲) ایمان اور اعمالِ صالح کا نتیجہ استخلاف فی الارض ہے (۵۵/۲۴)۔
(۱۳) جو قوم دوسری قوم کی جگہ لیتی ہے وہ اس سے بہتر ہوتی ہے (۳۶ — ۳۸/۱۴۷)۔

اب اگر یہ مان لیا جائے کہ انسان خدا کا خلیفہ ہے، تو آیت ۱۳ کے مطابق خلیفہ اصل سے بہتر ہوتا ہے۔ بات کہاں تک پہنچی۔ دراصل قرآنِ پاک میں خلیفۃ اللہ کا ذکر نہیں۔ انسان زمین پر پہلی قوم کا جانشین ہے۔
یہ تو ہوا قرآنِ کریم سے خلیفہ کا ثبوت۔ عربی میں پریڈ کاشن کچھ یوں ہیں۔ اَلْیَمِیْن دُور، رائٹ ٹرن۔ الیسار دور، لیفٹ ٹرن۔ اور اباؤٹ ٹرن کے لئے جو لفظ بولا جاتا ہے وہ ہے اِلیٰ الْخَلف دُور۔
طارق بن زیاد نے جہاز جلانے کے بعد اپنے تاریخی خطبے میں یہی الفاظ استعمال کئے تھے۔ خلف کم بحر و امامکم عدو۔ پیچھے سمندر ہے اور آگے دشمن ــــــ یہ تو تھا لفظ خلیفہ کا صحیح ترجمہ۔ اب ذرا یہ بھی دیکھ لینا چاہیئے کہ انگریزی میں نائب یا خلیفہ کے کیا معنی ہیں۔

TO SUCCEED — DEPUTY.	جانشین۔
TO TAKE THE PLACE.	کسی کی جگہ لے لینا۔
TO FOLLOW	کسی کے پیچھے آنے والا۔
TO COME AFTER	کسی کے بعد میں آنے والا۔
SUBSTITUTE	نعم البدل۔ قائم مقام
REPRESENTATIVE	مندوب۔ نمائندہ۔

اب سوچنے کا مقام ہے کہ ہے کوئی اللہ کا جانشین یا جگہ لینے والا یا اس کو فالو کرنے والا، اس کے بعد آنے والا قائم مقام، نعم البدل، مندوب اور نمائندہ ہو سکتا ہے؟
کہاں انسان اور کہاں اللہ کی نمائندگی، جانشینی۔ ایسا سوچنا بھی کفر ہے ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی وفات کے بعد مسلمانوں نے باہمی مشاورت سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنا امیر چن لیا اور انہیں خلیفہ رسول کہا کرتے تھے۔ ایک بدو انہیں خلیفۃ اللہ کہہ بیٹھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں ٹوکا اور کہا میں خلیفۃ اللہ نہیں، خلیفۃ رسولؐ ہوں۔ عرب میں آج بھی اگر کوئی وزیر چھٹی چلا جاتا ہے اور کوئی ملنے آتا ہے تو وہ پوچھتا ہے۔ مَنْ هُوَ بِالنِّيَابَةِ ؟ اس کی نیابت میں کون ہے ؟ مطلب یہ کہ نائب کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب اصل شخصیت غیر موجود ہو۔ جب اللہ موجود ہے تو نائب کی کیا ضرورت ہے۔ اور پھر انسان جس کی سوچ و فکر اپنے تک محدود ہے وہ لامحدود کی نیابت کے لائق ہی نہیں۔

اظہارِ تشکر

ہم حکومت کے شکر گزار ہیں کہ آلۂ شور و شغب (لاؤڈ اسپیکر) کے بے جا استعمال پر پابندی لگا دی گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ لاؤڈ اسپیکر شہریوں اور دیہاتیوں کے لئے یکساں طور پر دردِ سر بنا ہوا تھا۔

یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اس سے فرقہ واریت کی آگ بھڑکائی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ گوجرانوالہ کے ڈاکٹر فاروق کے قتل میں مسجد کا لاؤڈ اسپیکر استعمال ہوا۔ اسی اسپیکر سے اعلان ہوا کہ عطائی ڈاکٹر فاروق کا قتل واجب ہے۔

ہم نے مئی کے پرچے میں لاؤڈ اسپیکر کے خلاف لکھا۔ جون کا اداریہ بھی لاؤڈ اسپیکر کے خلاف لکھا۔ پاکستان کا سربرآوردہ شعور شہری حکومت کے اس فیصلے کا خیر مقدم کرے گا۔

ادارہ طلوعِ اسلام اس فیصلے پر وفاقی کابینہ کو مبارک باد پیش کرتا ہے اور یہ توقع رکھتا ہے کہ اس فیصلے پر سختی سے عمل کرایا جائے گا کیونکہ مولانا سمیع الحق و معہ نے ابھی سے اس کی مخالفت پر کمر باندھ لی ہے۔ ملک کے علماء و خطباء سے اپیل کی ہے کہ اس قانون کی اجتماعی خلاف ورزی کی جائے۔ حالانکہ یہی لاؤڈ اسپیکر (مکبر الصوت) جب پہلی بار آیا تھا تو دیوبند نے اسے حرام قرار دیا تھا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اعزاز الدین احمد خاں

میری زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ

جس نے مجھے ایک لغو عادت سے نجات دلائی

لغو عادت

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ یونہی عادتاً بات بات پر قسمیں کھاتے رہتے ہیں۔ بعض کی یہ عادت تکیہ کلام کی شکل اختیار کئے ہوتی ہے اور بعض، اپنی بات کو وزن دار بنانے کے لئے، بغیر سوچے سمجھے "اللہ کی قسم" "خدا کی قسم" کے الفاظ دہراتے رہتے ہیں۔ شکر کا مقام ہے کہ اس قسم کی قسموں کی قرآنِ حکیم کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں۔ وہ انہیں لغویات قرار دیتا ہے (۲:۲۲۵)۔ ورنہ، سوچئے، بات کہاں تک پہنچتی۔ مواخذہ انہی قسموں کا ہے جن میں دل کا ارادہ شامل ہو (۵:۸۹)۔ یہاں سے لغو کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ لغو سے مراد وہ چیزیں یا باتیں ہیں جو قابلِ اعتنا نہ ہوں۔ یعنی بے معنی، بے وزن، بے ہودہ سی باتیں جو شریف انسانوں کے شایانِ شان نہیں ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ وہ لغو سے اعراض برتتے ہیں (۲۳:۳؛ ۲۵:۷۲؛ ۲۸:۵۵)۔ جب "لغویات" بجائے خویش ناپسندیدہ بات ہے، تو اس قسم کی قسموں سے احتراز ضروری ہے۔ یہی ہم میں سے اکثر نہیں کرتے۔

طالب علمی کے زمانے میں مجھے بھی لغو قسمیں کھانے کی عادت تھی۔ کئی بار اس قبیح عادت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔ یہ عادت کیسے گئی؟ اس کا فوری سبب ایک چھوٹا سا مگر ناقابلِ فراموش واقعہ بنا جو آج سے قریباً ۵۴ سال پہلے میری آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سُنا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن میں نے پھر کبھی دانستہ طور پر قسم نہیں کھائی۔ اگر کبھی غیر ارادی طور پر قسم زبان پر آ بھی جائے، تو یک دم میرے کانوں میں اس ہندو لڑکے کا طعنہ گونجنے لگتا ہے، جو اس واقعہ کا مرکزی کردار تھا، اور میں محتاط ہو جاتا ہوں۔

ہندو لڑکے کا طعنہ

۱۹۴۰ء میں، میں گورنمنٹ کالج، لاہور، میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ رہائش ہماری پیر مکی، راوی روڈ، لاہور میں ہوا کرتی تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار بینی کر رہا تھا کہ اچانک گلی میں شور اٹھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے دو بچے آپس میں لڑ رہے ہوں۔ میں نے جلدی سے دو دروازہ کھولا جو گلی کی جانب کھلتا تھا۔ چک کے پیچھے سے میں نے دیکھا کہ گلی کی سڑک کے دوسری جانب، خالی پلاٹ میں، دو بچے جن کی عمریں تیرہ چودہ سال کے لگ بھگ ہونگی، ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک مسلمان لڑکا تھا اور ہمارے مسلمان پڑوسی کا نوکر تھا اور دوسرا ہندو تھا جو گلی میں رہنے والے ایک ہندو کا ملازم تھا۔ ان کی آپس میں لڑائی ایک "بنٹے" کی خاطر ہو رہی تھی۔ ("بنٹے" شیشے کی گولیاں جو بنٹے کے کھیل میں استعمال ہوتی ہیں۔ ایک بچہ اپنی انگلی کی نوک پر 'بنٹا' رکھ کر دوسرے کے نزدیک پڑے 'بنٹے' کا نشانہ لیتا ہے، اگر نشانہ لگ جائے تو وہ 'بنٹا' اس کا ہو جاتا ہے)۔ مسلمان لڑکے نے ہندو لڑکے کو گلے سے پکڑا ہوا تھا اور بڑے تحکمانہ انداز سے مطالبہ کر رہا تھا "دے میرا بانٹا۔ میں نے جیتا ہے۔" (پنجابی میں)۔

ہندو لڑکا اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ کہتا بھی جا رہا تھا:

"نہیں دیتا۔ تو نے جیتا ہی نہیں۔ کیوں دوں؟"

مسلمان لڑکا (غصہ بھری آواز میں): "دے گا کیسے نہیں"

ہندو لڑکا (اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے): "تیرا بنٹا لگا ہی نہیں تھا۔ کیوں دوں؟"

مسلمان لڑکا: "لگا تھا۔" یہ کہتے ہوئے ہندو لڑکے کی طرف پھر بڑھا۔

ہندو لڑکا: (پیچھے ہٹتے ہوئے) "کھا قسم"

مسلمان لڑکا (بغیر کسی توقف کے) "خدا کی قسم"

ہندو لڑکا ہکا بکا ہو کر مسلمان لڑکے کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھنے لگا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ مسلمان لڑکے نے صرف ایک بنٹے کی خاطر خدا کی قسم کھا لی تھی۔ چونکہ میں نے اس ڈرامے کا پہلا حصہ نہیں دیکھا تھا اس لئے کہہ نہیں سکتا کہ مسلمان لڑکے نے بنٹا جائز طور پر جیتا تھا یا نہیں۔ ان دونوں کی گفت گو سننے کے بعد مجھے شبہ ضرور ہوا تھا کہ مسلمان لڑکا زبردستی کر رہا تھا۔ قسم کھانے کے بعد، ہندو لڑکے کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے، مسلمان لڑکے نے پھر تحکمانہ انداز میں تقاضا کیا: "اب دے بنٹا"

دل تھام کے سنئے۔ ہندو لڑکے نے کیا کہا:

"اوئے! تیرا خدا اتنا چھوٹا ہے کہ تو نے اسے ایک بنٹے کی خاطر بیچ دیا!!" (معاذاللہ ثم معاذاللہ)۔

پھر اُس نے حقارت کے انداز میں ایک بنٹا زمین پر دے مارا۔

"رکھ اِسے"۔ یہ کہتے ہوئے ہندو لڑکا وہاں سے چلا گیا۔

اُف! کتنا زہر تھا ہندو بچے کے طعنہ میں۔ میں کانپ گیا۔ مسلمان لڑکا تو بنٹا اٹھا کر غائب ہو چکا تھا۔ لیکن میں بہت دیر تک ایک سکتے کے عالم میں اس جگہ کو دیکھتا رہا جہاں کچھ دیر پہلے ایک ایسا واقعہ رونما ہوا تھا جس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہندو لڑکے کی آواز برابر میرے کانوں میں گونج رہی تھی ـــ "اوئے! تیرا خدا اتنا...... اوئے! تیرا خدا اتنا......" میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں لیکن وہ آواز گونجتی رہی۔ دل ہی دل میں مسلمان لڑکے کو کوس رہا تھا کہ اگر وہ اپنی مقصد براری کے لئے قسم نہ اٹھاتا تو ہندو لڑکے کا "طعنہ" سُننا نہ پڑتا۔ جب میں نے اس واقعہ پر ٹھنڈے دل سے غور کیا تو یہ کڑوی حقیقت سامنے آئی کہ "لغویات" کے معاملے میں ہم سب ننگے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ مسلمان لڑکے کو موردِ الزام ٹھہرانے سے کیا حاصل، جب ہم خود اس "جرم" (لغو قسمیں کھانے کا جرم) سے پاک نہیں۔ پہلے ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہیئے۔ اس دن میں نے صدقِ دل سے اپنا احتساب کیا اور لغو قسمیں کھانے سے توبہ کی اور عہد کیا کہ آئندہ اپنی مقصد براری کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاک نام کو آڑ نہیں بناؤں گا۔ اس عہد پر میں آج تک سختی سے قائم ہوں۔ الحمد للہ۔

اس وقت مجھے احساس نہیں تھا کہ حکمِ خداوندی بھی یہی ہے کہ اپنی قسموں کے ذریعے اللہ کو (اپنی مقصد براری کے لئے) آڑ مت بناؤ (۲:۲۲۴ اور دیکھئے ۳:۷۶)۔ اس وقت میرے پیشِ نظر صرف ہندو لڑکے کا طعنہ تھا۔ بعد میں جب میں نے قرآنِ حکیم کی روشنی میں ہوش سنبھالا تو میرا سر ندامت سے ایک بار پھر جُھک گیا۔ ہمارے معاشرے میں خود غرضی، مفاد پرستی، نفسا نفسی کی بھگدڑ اس قدر مچی ہوئی ہے کہ لوگ اس حکمِ خداوندی کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ اللہ کا نام (قسموں کے ذریعے سے) آج بھی "بنٹوں" کے عوض بک رہا ہے (معاذاللہ)۔ صرف "بنٹوں" کی نوعیت بدل گئی ہے۔ لیکن ہماری جرأتِ رندانہ تو دیکھئے اس کی رحمت کے بدستور طلب گار ہیں!

○○○

پاکستان کے پانچ ٹکڑے

معین باری سابق ایم این اے

قرآنِ پاک میں ذکر ہے "فتنہ قتل سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے"۔ نپولین نے کہا تھا کہ ایک فتنہ پرداز یعنی منجھا ہوا جاسوس جو صحیح مقام پر کام کر رہا ہو بیس ہزار فوج کے برابر ہوتا ہے۔

عالمی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا، روس کو خطرہ تھا کہ جرمن اور جاپان دونوں مل کر کہیں روس پر حملہ نہ کردیں۔ اس لئے روسیوں نے جاپانیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ۲۔ لاکھ فوج سائبیریا میں جمع کر رکھی تھی۔ ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو جرمن افواج نے ماسکو کی سمت پیش قدمی شروع کی تو روسی جاسوس رچرڈ سرج نے جو ٹوکیو میں کام کر رہا تھا، تار بھیجا کہ "جاپان روس پر حملہ نہیں کرے گا کیونکہ جاپانیوں نے جنوب میں حملہ آوری کی منصوبہ بندی کی ہے"۔ اس اطلاع پر روسی ہائی کمان نے فوراً دو لاکھ فوجیوں کو سائبیریا سے مغربی محاذ پر جرمنوں کے مقابلہ میں منتقل کرنا شروع کردیا۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران صرف ایک فرنگی جاسوس (کرنل ٹی ای لارنس برٹش ایجنٹ) نے سرزمینِ عرب سلطنتِ عثمانیہ کا تختہ الٹ دیا۔ وہاں لارنس نے اربوں روپے رشوت دے کر پہلے بعض عرب سرداروں کو ملایا۔ ان کے اندر عرب نیشنلزم بیدار کیا۔ ترکوں کے خلاف نفرت پھیلائی۔ پھر انہیں جنگی ساز و سامان مہیا کر کے عربوں کو ترکوں کے ساتھ لڑا دیا۔

۷۱-۱۹۷۰ء میں بھارتیوں کو مشرقی پاکستان میں کرنل لارنس کی شکل میں مجیب الرحمٰن مل گیا۔ اس فتنہ پرداز نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بھارتی سرمایہ اور اسلحہ کے زور پر بنگالی نیشنلزم کو ہوا دی اور ایسا طوفان کھڑا کردیا کہ پاکستان دو لخت ہو گیا۔

آج وطنِ عزیز یعنی مغربی پاکستان بھی کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہے۔ سازشی جال بچھا رہے ہیں کہ پاکستان کے مزید پانچ ٹکڑے کر دیئے جائیں اور بھارت اپنی مسلح افواج کو کیل کانٹے سے لیس کر کے حملہ آوری کے لئے صف بندی میں مصروف ہے۔

پاکستان کے بڑے بڑے شہروں پر بھارت، اسرائیل جارحیت کا خطرہ دن بدن بڑھتا جارہا ہے جس کے تدارک کے لئے فی الحال فقط بیان بازی سے کام لیا گیا ہے۔ ان شہروں کے بچاؤ کے لئے کوئی مؤثر اور فعال اقدام مشاہدہ میں نہیں آیا۔ البتہ سیاسی قائدین کے ایک دوسرے پر الزامات اور جوابی الزامات کا سلسلہ جاری ہے اور ملی طاقت جو اتحاد اور یک جہتی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی ارباب اختیار اور حزبِ اختلاف کے پاٹوں میں پستی نظر آتی ہے۔

ایک امریکن پاکستانی کا مضمون "پانچ ریاستیں بنانے کا منصوبہ" نظر سے گزرا۔ پاکستانی کا نام راؤ امیر علی خان ہے جو کئی سالوں سے امریکہ میں مقیم اور وہاں "فرینڈز آف ہیومینٹی" کی ذیلی شاخ "فرینڈز آف پاکستان سوسائٹی" کا سربراہ ہے۔ مضمون نگار نے اس حقیقت کو ہائی لائٹ کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہودیوں کی طرف سے پاکستان توڑنے اور اس کی جگہ پانچ آزاد ریاستیں قائم کرنے کے لئے "سی ایکس آر پلان اپریل ٹائیڈ ۹۲ء" کا آغاز ہو چکا ہے اور اس منصوبہ کے مطابق دسمبر ۱۹۹۵ء تک ٹارگٹ حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دی گئی ہیں۔ امریکہ کا پریس امریکہ کی سیاست اور امریکی سینٹ مکمل طور پر "سی ایکس آر" (یہودی تنظیم) کے قبضہ میں ہے اور جو ان کے قبضہ قدرت سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اسے راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ پاکستان اور افغانستان کے تعلقات خراب کروانے میں بھی "سی ایکس آر" کا ہاتھ ہے۔ ایشیا کی ریاستیں جن کے معاشی روابط بڑی تیزی کے ساتھ پاکستان کے ساتھ استوار ہو رہے تھے، انہیں آج مکمل طور پر بھارت کے توسیع پسندانہ معاشی عزائم کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ حیران کن بات ہے کہ نجیب اللہ کو اقوام متحدہ کے افسران جیل سے نکال کر ایک محفوظ مقام پر پہنچا چکے ہیں۔ ہماری تنظیم نے بھارت کے سکالرز کو بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ "سی ایکس آر پلان" یہ ہے کہ پہلے بھارت کو استعمال کر کے ہمسایہ ملکوں کو دبایا جائے۔ پھر بھارت کے ٹکڑے کئے جائیں اور اس کی جگہ ۱۵ آزاد ریاستیں قائم کی جائیں جن کے یہودیوں کے پیپرز میں نام یہ ہیں۔ خالصتان، گورکھا لینڈ، بوڈو لینڈ، تری پورہ، میزورام، منی پور، ناگا لینڈ، اودوچل پردیش، مخالیہ دراوڑ، جھرکنڈ، اترکھنڈ، آسام اور تامل ناڈو وغیرہ۔

پاکستان کے پانچ ٹکڑے یہ ہوں گے (۱) پختونستان (۲) بلوچستان (۳) سندھ (۴) پنجاب (۵) سندھ سے کراچی کو الگ کر کے اسے لیاقت آباد کا نام دیا جائے گا۔ لیاقت آباد ایک بین الاقوامی بندرگاہ ہو گی جسے کسی بڑی طاقت کے اثر و رسوخ میں دبا جانا مقصود ہے۔ مضمون نگار اس سلسلے میں پیر پگاڑہ سے بھی ملے تو پیر صاحب نے انہیں ایک بیرون ملک شائع شدہ کتاب دکھائی جس میں لکھا ہے کہ ۲۰۰۰ء کے بعد بلوچستان کی آزاد ریاست کہاں پہنچ جائیگی۔

کشمیر میں استصواب رائے کی بجائے تھرڈ آپشن کے تحت اسے خود مختار اور آزاد دیش بنایا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے پاکستان میں امان اللہ، سلطان محمود اور مقبوضہ کشمیر میں فاروق عبداللہ اور غلام نبی کام کر رہے ہیں۔

۱۹۹۲ء میں پاکستان میں ۵۔ امریکی سینیٹرز آئے تھے جو سب یہودی تھے۔ یہی افراد عراق جنگ سے پہلے صدام سے ملنے گئے تھے۔ پھر جو عراق سے ہوا' وہ سب پر عیاں ہے۔ ان کی پاکستان آمد کی خبر کے بعد ہی ہماری تنظیم چوکس ہوئی اور مجھے پاکستان بھیجنے اور یہودی سی ایکس آر پلان کو ناکام بنانے کا مشن سونپا گیا۔

دیکھیں اب کی بار سی ایکس آر پلان کو بروئے کار لانے میں عالمی سازشیوں کو پاکستان کے اندر کون سا کرنل لارنس یا مجیب الرحمان ملتا ہے۔

(بشکریہ 'محقق' جون ۱۹۹۴ء)

سیاسی پارٹیاں

دین میں جب مذہبی فرقے نہیں ہوں گے تو الگ الگ سیاسی پارٹیاں کس طرح وجود پذیر ہو سکیں گی؟ مذہبی فرقہ اور سیاسی پارٹی کی تفریق مذہب میں ہوتی ہے جس میں سیاست اور مذہب الگ الگ ہوتے ہیں دین میں سیاست اور مذہب میں کوئی تفریق نہیں۔ ہوتی اس لئے اس میں نہ کوئی مذہبی فرقہ ہوتا ہے نہ سیاسی پارٹی۔ اس میں امتِ مسلمہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک پارٹی ہوتی ہے۔ خود اس امت کے اندر پارٹیاں نہیں ہوتیں۔ نہ ہی اس کے ایوان میں' امت دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہوتی ہے۔ ایک حزب اقتدار اور ایک حزب اختلاف۔ قرآن کریم نے تمام نوعِ انسان کو دو قوموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک مومن اور دوسری کافر۔ انہی کو وہ دو حزب کہہ کر پکارتا ہے۔ ایک حزب اللہ اور دوسری حزب الشیطٰن (۲۲ - ۱۹/۵۸) اسلامی مملکت کے ایوان (پارلیمان) میں تمام کے تمام ارکان وہ ہوں گے جو قرآن کریم کے عطا کردہ اصول و اقدار پر ایمان رکھتے ہیں اور جن کا فریضہ ان اصول و اقدار کو قانونی شکل دے کر ملک میں نافذ کرنا ہے۔ اس ایوان میں غور و فکر اس مسئلہ پر ہو گا کہ ان اصولوں کو بہ حالاتِ موجودہ نافذ کس طرح کیا جائے۔ یعنی یہ لوگ پارلیمان میں بیٹھ کر مملکت کیلئے اصول و اقدار وضع نہیں کریں گے بلکہ صرف یہ سوچیں گے کہ ان اصول و اقدار کی تنفیذ کیلئے طریقہ کونسا اختیار کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہر رکن اپنی اپنی رائے پیش کرے گا اور جو فیصلہ ہو گا اس کا اطلاق ہر ایک پر ہو جائے گا۔ اس میں حزب اقتدار کے بجائے بھی عمالِ حکومت (کارندے) ہوں گے جن کا فریضہ یہ دیکھنا ہو گا کہ اس فیصلہ پر ٹھیک ٹھیک عمل ہو رہا ہے'

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویز

رشوت

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ناجائز طریقے سے دولت کمانا بہت بُرا ہے۔ اور اس کی سب سے بُری شکل رشوت لینا ہے۔ اس سے انصاف کا خون ہو جاتا ہے۔ حق دار کا حق مارا جاتا ہے۔ بےگناہ پر ظلم ہوتا ہے اور سارے معاشرے میں خرابیاں ہی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے ناجائز کمائی کے ہر طریقے کو حرام قرار دیا ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (۲/۱۸۸)

"ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔"

اس لئے رشوت لینا بالکل ناجائز ہے۔

رشوت لینا

لیکن قرآنِ کریم نے رشوت لینے ہی کو بُرا قرار نہیں دیا، رشوت دینے کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔ جو آیت اوپر لکھی گئی ہے اس کا باقی حصّہ یہ ہے۔

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ ..... ۝ (۲/۱۸۸)

"اور ایسا بھی نہ کرو کہ مال و دولت کو حاکموں تک پہنچنے کا ذریعہ بنا لو تاکہ دوسروں کے مال کا کچھ حصّہ ناحق حاصل کر لو۔"

رشوت دینا

مدعی (دعویٰ کرنے والے) کا فرض ہے کہ وہ صرف اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کا دعویٰ کرے گواہ کا فرض ہے کہ وہ سچی سچی بات کہے حاکم کا فرض ہے کہ وہ پورا پورا انصاف کرے۔

اس میں رشوت دینے یا لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو ایسا کرتا ہے وہ اسلامی معاشرہ کا مجرم ہے۔